جلد ۶۹ ماہ شعبان المعظم ۱۳۷۱ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۵۲ء عدد ۵

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۳۲۲-۳۲۴

مقالات

یونانی فلسفہ کے تاریخی ماخذ — مولانا عبدالسلام ندوی، — ۳۲۵-۳۳۵

اردو شہ پارے کی چند قابل توجہ فروگذاشتیں — ڈاکٹر نذیر احمد ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ، لکچرر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی، — ۳۳۶-۳۵۶

دلی اور لکھنؤ کی زبان، — جناب شوکت صاحب سبزواری ایم اے، لکچرار اردو ڈھاکہ یونیورسٹی، — ۳۵۷-۳۷۴

قائم چاندپوری کا غیر مطبوعہ کلام — جناب محمد علی خان صاحب اثر رامپوری — ۳۷۵-۳۸۸

موتمر مستشرقین استنبول — جناب مولانا سید بدرالدین صاحب علوی استاد شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی، — ۳۸۹-۳۹۳

ادبیات

دور انقلاب — جناب شاہ ولی الرحمٰن صاحب ڈپٹی کلکٹر آرہ — ۳۹۴-۳۹۵

غزل — جناب سرورش عسکری طباطبائی — ۳۹۵

غزل — جناب عارف عباسی — ۳۹۶

مطبوعات جدیدہ — "م" — ۳۹۷-۴۰۰

شذرات

جامعہ عثمانیہ کے ہندی یونیورسٹی بنائے جانے کی خبر عرصہ سے گرم تھی، بالآخر یہ حادثہ ہو کر رہا، اب اس کا انتظام مرکزی حکومت کے ہاتھوں میں آجائے گا، اور اس کا ذریعہ تعلیم ہندی زبان ہوگی، ہندوستان کا پورا نظام تعلیم ہی ہندیایا جارہا ہے اور رفتہ رفتہ تمام یونیورسٹیوں کی تعلیمی زبان ہندی ہو جائیگی، اردو کی یونیورسٹی صرف ایک جامعہ عثمانیہ تھی، اگر حکومت اس کو باقی رہنے دیتی، تو اس کا کیا بگڑ جاتا، اور اس سے ہندی کو کیا نقصان پہنچتا، مگر اردو دشمنی کو اتنا بھی گوارا نہ ہوا، اور اردو کی اس تنہا یونیورسٹی کو بھی مٹا دیا گیا،

صبح تک تو نے نہ چھوڑی وہ بھی اے بادِ صبا یادگارِ شمع تھی کل تک جو پروانے کی خاک

جامعہ عثمانیہ بڑی ریاضت کا پھل، اور ملکی زبان میں تعلیم کا ایسا کامیاب تجربہ تھا جس کا اعتراف یورپ کی یونیورسٹیوں تک کو کرنا پڑا، اس کا عظیم الشان اور بیش قیمت علمی ذخیرہ جو کروڑوں روپئے کے صرف اور بڑے بڑے فضلاء اور اصحاب علم و کمال کی برسوں کی محنت و جانکاہی کا نتیجہ تھا، اس طرح چشم زدن میں خاک میں ملا دیا گیا، اب ردی کے سوداگروں کے کام میں آئے گا، اس لئے یہ واقعہ ایسا دردناک علمی حادثہ ہے جو صرف اردو دشمنی بلکہ علم و تہذیب سے بھی دشمنی کا ثبوت ہے،

پرانے زمانہ کے بعض فاتحوں کو آج صرف اس لئے غارت گر اور دشمن علم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے

کہ انھوں نے مفتوح قوموں کے علمی ذخیروں اور تہذیب و تمدن کو مٹایا تھا، کیا جامعہ عثمانیہ کی یہ بربادی اس سے کم ہے، بلکہ ان میں سے کچھ ایسے بھی نکل آتے تھے، جو مفتوح قوموں کے علوم سے فائدہ اٹھانے کے لئے ان کو محفوظ رکھتے تھے، مگر ہماری حکومت کا کارنامہ ان غارتگروں سے بھی بڑھ گیا، اور اس حکومت کے ہاتھوں انجام پایا، جو جمہوری اور سیکولر کہلاتی ہے، جامعہ عثمانیہ کو ختم کر دینا تو آسان ہے، مگر تاریخ اس واقعہ کو فراموش نہ کرے گی، اور آیندہ نسلیں اس علم نوازی کو عبرت کے ساتھ یاد کرتی رہیں گی،

یہ خبر بڑی مسرت افزا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی پرو وائس چانسلری کے لئے افضل العلماء مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب سابق پرنسپل محمڈن کالج مدراس کا انتخاب ہوا ہے، مولانا عبدالحق صاحب سے علمی و تعلیمی حلقوں کے علاوہ شمالی ہندوستان کے لوگ کم واقف ہوں گے، موصوف مشرقی و مغربی دونوں علوم کے فاضل اور عالم باعمل ہیں، انھوں نے عربی کی تکمیل کے بعد انگریزی کی تعلیم اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈی فل کی ڈگری حاصل کی، عام طور سے انگریزی کی تعلیم عربی تعلیم کے اثرات کو بہت کم کر دیتی ہے، مگر مولانا عبدالحق صاحب کی ذات اس سے مستثنیٰ اور مسلمانوں کی دینی اور دنیوی تعلیم کا مثالی نمونہ ہے،

بہت عرصہ ہوا کہ موصوف آکسفورڈ کی واپسی کے بعد دارالمصنفین تشریف لائے تھے، اور اس وقت جب تازہ وارد ولایت تھے، ان کی دینداری، مولویانہ وضع اور سادگی کو دیکھ کر کوئی شخص یہ قیاس بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ان کو انگریزی سے دور کا بھی علاقہ ہے، وہ ہندوستان کے چند مسلمان ماہرین تعلیم میں سے ایک ہیں، مسلمانوں کی تعلیم سے ان کو بڑی دلچسپی ہے، مدراس میں انھوں نے اُن کی بڑی تعلیمی خدمات انجام دیں، ان کے متعدد اسکول اور کالج قائم کئے، اس لحاظ سے ان کو مدراس کا سرسید کہنا چاہئے، اس لئے مسلم یونیورسٹی کی پرو وائس چانسلری کے لئے ان کا انتخاب نہایت موزوں و مناسب ہے، اور یہ یونیورسٹی کی

خوش قسمتی ہو کہ اسکو مولینا عبد الحق صاحب جیسے فاضل ماہر تعلیم اور دیندار مسلمان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا موقع
مل گیا، یقین ہے کہ ان کے تعلیمی تجربات سے یونیورسٹی کو بڑا فائدہ پہنچے گا، اور ان کے اخلاقی و دینی اثر
سے طلبہ کے خیالات اور زندگی مین بھی تبدیلی پیدا ہوگی،

مسلمانون کے لئے ایک روزانہ انگریزی اخبار کی جس قدر ضرورت ہے، وہ ظاہر ہے، مگر آج تک
ان کو اس کی توفیق نہین ہوئی، اس ضرورت کے پیش نظر جمعیۃ العلماء نے مسیج کے نام سے ایک پندرہ روزہ
اخبار نکالا ہے، اگرچہ کچھ نہ ہونے کے مقابلہ مین یہ بھی غنیمت ہے، مگر اصل ضرورت روزانہ اخبار کی ہے؛
ہندوستان مین ہندوؤن کے درجنون اور پاکستان مین مسلمانون کے کئی انگریزی روزنامے نکلتے ہین؛
ایسی حالت مین ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانون کے لئے ایک انگریزی اخبار کا چلانا کیا مشکل ہی، وہ اپنی
شکایتون کے لئے زبانی شور و غوغا تو بہت کرتے ہین، مگر ان کے ازالہ کی صحیح تدبیر اختیار نہین کرتے، اگر وہ
صرف اتنا کرین کہ پیسہ خرچ کر کے انگریزی کے زہریلے فرقہ پرست اخبارات کی گالیان سننے کے بجائے
مسیج کے خریدار بن جائین تو کسی امداد کے بغیر وہ آسانی سے روزانہ بن سکتا ہی،

اردو علاقائی زبان کی مہم جس زور شور سے اٹھی تھی، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ دو تین مہینے کے اندر
مطلوبہ دستخط فراہم ہو جائین گے، مگر پھر اس کی رفتار اتنی سست پڑ گئی کہ مقررہ مدت مین توسیع کرنا پڑی،
مگر کام کی موجودہ رفتار سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید توسیعی مدت بھی ناکافی ہوگی، یہ کام دیر سویر پورا تو
بہرحال ہو جائے گا، مگر اردو کے حامیون کی کاہلی اور سستی ضرور قابل شکایت ہے، اور اس کام کو زیادہ
جوش اور مستعدی سے کرنے کی ضرورت ہے،

مقالات

یونانی فلسفہ کے تاریخی ماخذ

فلسفۂ ارسطو کی اشاعت

از مولانا عبد السلام ندوی

(۲)

یونان مین جس قدر فلسفی پیدا ہوئے ان کی تین قسمین تھین،

(۱) ایک فرقہ تو دہریون کا تھا، جو خدا کے وجود کا بالکل منکر تھا، اور عالم کو قدیم اور غیر مخلوق مانتا
تھا، قدماے فلاسفۂ یونان کا یہی عقیدہ تھا، اور سب سے پہلے تالیس ملطی کو جب دنیا مین اختلافات نظر آئے
تو اس نے یہ نظریہ قائم کیا کہ خدا کی ذات جو اوصافِ حسنہ کے ساتھ متصف ہو، وہ اس قسم کی متضاد و
متباین چیزین پیدا نہین کر سکتی، اس لئے سرے سے خدا کا وجود ہی نہین ہی قفطی نے لکھا ہے کہ جمہور
اہل ہند نے اس نظریہ کو قبول کر لیا[1] لیکن مسلمان اس نظریہ کو جو ان کے مذہب کے بالکل مخالف تھا،
قبول نہین کر سکتے تھے، اس لئے اس کے فلسفیانہ خیالات مسلمانون مین نہ پھیل سکے،

۲- دوسرا فرقہ حکماے طبعیین کا تھا، جس نے طبیعت کے افعال و تاثیرات اور نباتات و حیوانات کے اعضا کی ترکیب
اور اس ترکیب سے پیدا شدہ قوتون سے بحث کی اور اس ترکیب مین اس کو جو حکمتین نظر آئین ان کی بنا پر اوس نے یہ

[1] اخبار الحکما ص ۵،

نظریہ قائم کیا کہ ان کا پیدا کرنے والا ایک فاعل مختار قادر و حکیم ہے، جس نے تمام موجودات کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے، لیکن جب اس کو نظر آیا کہ تمام موجودات جن عناصر سے پیدا ہوئے ہین، اُن کی حالت یہ ہے کہ ایک خاص حد تک پہنچ کر وہ بالکل فنا ہو جاتے ہین، تو اس نے بعینہ یہی رائے انسان کے متعلق بھی قائم کی، کہ جب تک اوس کو طبعی قوتون سے مدد ملتی رہتی ہے، وہ زندہ رہتا ہے، پھر فنا ہو جاتا ہے، اُس کے بعد دوبارہ زندہ نہین ہوتا، اس لئے وہ حشر و نشر کا منکر تھا، اور اس لئے اس فرقہ کا شمار بھی دہریون مین کیا جاتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ مذہبی حیثیت سے یہ نظریہ بھی مسلمانون مین مقبول نہین ہو سکتا تھا،

(۳) تیسرا فرقہ حکماے الٰہیین کا تھا، جس مین تمام متاخرین حکماے یونان شامل تھے، اسکی ابتدا سقراط سے ہوئی، اس کے بعد اس کے شاگرد افلاطون نے اس کو ترقی دی، اور افلاطون کے شاگرد ارسطو نے اس کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا، جس نے اس فرقہ کے اصول و قواعد کو مستحکم کیا، اور دہریون اور طبیعیون کے عقائد و نظریات کی تردید کی اور ایک مدت تک ان گمراہ فرقون سے بحث و مناظرہ کرتا رہا، اس سے پہلے سقراط اور افلاطون نے بھی ان فرقون سے بحث و مناظرہ کیا تھا، لیکن ان دونون نے ان فرقون کی تردید مین جو دلائل قائم کئے تھے، اور جو اصول و قواعد بنائے تھے، وہ ارسطو کو کمزور معلوم ہوئے، اس لئے اس نے ان دلائل اور اصول و قواعد کو نظرانداز کر دیا، اور اُن کے جواب مین قوی دلائل قائم کئے، اور مسلمانون کے لئے اس قسم کے گمراہ فرقون کے ساتھ مناظرہ و مباحثہ کرنے کا راستہ صاف کر دیا، تاہم چونکہ اُس کے دلائل کی بنیاد کسی آسمانی کتاب پر نہ تھی، اس لئے اس کے مباحث مین بھی چند کافرانہ عقیدے باقی رہ گئے، اور اس کے بعد جن لوگون نے اس کی کتابون کا ترجمہ یونانی زبان سے رومی، سریانی، فارسی، اور عربی زبانون مین کیا، انھون نے ان میں مزید تحریفات کین، البتہ ارسطو کے مقاصد کے سمجھنے مین ابونصر فارابی اور ابن سینا نے سب سے زیادہ کامیابی حاصل کی، اور

ان کو بہترین طریقہ پر ادا کیا[1]، اور متاخرین حکماے اسلام مین فلسفۂ ارسطو کی اشاعت انہی دونون کے ذریعہ سے ہوئی، شہرستانی نے ملل و نحل مین لکھا ہے کہ

"متاخرین حکماے اسلام مثلاً یعقوب بن اسحاق کندی، حنین بن اسحاق، یحییٰ نحوی، ابو الفرج المفسر، ابو سلیمان سنجری، ابو سلیمان محمد المقدسی، ابو بکر ثابت بن قرہ، ابو تمام یوسف بن محمد نیشاپوری، ابو زید احمد بن سہل البلخی، ابو المحارب الحسن بن سہل، ابن حارب القمی، احمد بن طیب سرخسی، طلحہ بن محمد نسفی، ابو حامد احمد بن محمد الاسفرائنی، عیسیٰ بن علی الوزیر، ابو علی احمد بن مسکویہ، ابو زکریا یحییٰ بن عدی الضمیری، ابو الحسن العامری، ابو نصر فارابی، حسین بن عبد اللہ بن سینا وغیرہ نے تمام تر ارسطو کا مسلک اختیار کیا، صرف چند مسائل مین افلاطون اور قدماے فلاسفہ کی رائے اختیار کی، لیکن چونکہ اس جماعت کے نزدیک ابن سینا کا طریقہ نہایت دقیق و عمیق تھا، اس لئے اس جماعت نے اسی کے طریقہ کو ایجاز و اختصار کے ساتھ اس کی کتابون سے نقل کیا، اور بقیہ لوگون کے طریقون کو نظرانداز کر دیا،"[2]

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمانون مین فلسفۂ یونان کی اشاعت صرف ترجمون کے ذریعہ سے ہوئی اور خلیفہ ابو جعفر منصور کے زمانہ سے لیکر مامون کے زمانہ تک صرف ترجمے کا کام ہوتا رہا، اور مامون کے زمانہ تک زیادہ تر ارسطو کی کتابون کے ترجمے ہوئے، لیکن یہ ترجمے ایک دوسرے کے مخالف، غیر واضح اور مخلوط تھے، اور وہ ابو نصر فارابی کے زمانہ تک اسی حالت مین باقی رہے، بلکہ معدوم ہونے کے قریب ہو گئے، ان ترجمون کی اس حالت کو دیکھ کر منصور بن نوح سامانی نے جو فارابی کے زمانے مین فرمانروائی کر رہا تھا، فارابی سے درخواست کی کہ ان تمام تراجم کو جمع کر کے ایک عمدہ ترجمہ تیار کر دے، چنانچہ فارابی نے ان تمام ترجمون کی تہذیب، ترتیب اور تلخیص کی، اور ان کو ایک مستقل کتاب مین جمع کر دیا، جس کا نام اس

[1] اخبار الحکماء ص ۲۰، ۲۹ [2] ملل و نحل شہرستانی جلد ۳ برحاشیہ ملل و نحل لابن حزم ص ۹۳، ۹۴

تعلیم ثانی رکھا، اور اسی کتاب کی وجہ سے وہ معلم ثانی کے لقب سے مشہور ہوا، یہ کتاب منصور بن نوح
سامانی کے کتب خانے مین داخل کی گئی، اور منصور کے پوتے سلطان مسعود کے زمانے تک اس کا
مسودہ خود فارابی کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود تھا، اس کے بعد جب ابن سینا نے طب کے ذریعہ اس کے
دربار مین رسائی حاصل کی، اور رفتہ رفتہ ترقی کرکے وزیر بن گیا، تو اس نے اسی کتب خانے کی کتابون
مین تعلیم ثانی کا ایک نسخہ پایا، اور اسی کی تلخیص کرکے ایک مستقل کتاب تیار کرلی، جس کا نام شفا ہے،
اس کے بعد یہ کتب خانہ جل گیا، اور ابن سینا پر یہ الزام لگایا گیا کہ اوس نے خود اس کتب خانہ کو
جلادیا، تاکہ وہ خود فلسفہ کا بانی قرار پائے، لیکن یہ الزام بالکل غلط ہے، شیخ نے اپنے بعض رسالون
مین خود تصریح کی ہے کہ اُس نے فن حکمت کو اسی کتب خانہ سے سیکھا ہے، اور خود شفا کے بہت سے
مقامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تعلیم ثانی کی تلخیص ہے[1]،

خود فارابی نے یونانی فلسفہ کی اشاعت کی، جو تاریخ بیان کی ہے، اُس سے معلوم
ہوتا ہے کہ فلسفہ کی تعلیم کی اشاعت مشرق مین صرف ارسطو کی تصنیفات سے ہوئی، چنانچہ وہ
لکھتا ہے کہ

یونانی بادشاہون کے زمانہ اور ارسطو کی وفات کے بعد اسکندریہ مین فلسفہ کی اشاعت
ہوئی، اور ارسطو کی وفات کے بعد بھی اسکندریہ مین یہ تعلیم جاری رہی، یہان تک کہ اس کے
بعد تیرہ بادشاہ ہوئے، اور ان کے زمانہ حکومت مین پے درپے فلسفہ کے بارہ معلم پیدا
ہوتے رہے، جن مین ایک کا نام اندرونیقوس تھا، ان بادشاہون مین آخری فرمانروا
ایک عورت تھی، جس پر روم کے بادشاہ اوغسطس نے غلبہ حاصل کرکے اوس کو قتل
کردیا، جب اس کی حکومت کو استحکام حاصل ہوا، اور اس نے کتب خانون کو دیکھا تو
ان مین ارسطو کی کتابون کے وہ نسخے نظر آئے، جو خود ارسطو اور شاگردون کے زمانے

[1] کشف الظنون جلد اول ص ۴۴۳،

مین لکھے گئے تھے، اُس کے زمانہ مین ایسے بہت سے فلاسفہ بھی موجود تھے، جنھون نے اوس
موضوع پر کتابین لکھی تھین، جس پر ارسطو لکھ چکا تھا، اس لئے اس نے حکم دیا کہ ارسطو اور
اُس کے شاگردون کے زمانہ مین جو نسخے لکھے گئے ہین، اُن کی نقل لے لی جائے، اور
ان ہی کے ذریعہ سے تعلیم دی جائے، اور بقیہ کتابین چھوڑ دیجائین، اس نے اس کام
کو اندرونیقوس کے سپرد کیا، اور اس کو حکم دیا کہ اُن کی چند نقلین لے لی جائین، جن مین ایک
نقل کو وہ روم مین لے جائے گا، اور ایک نقل اسکندریہ مین رہے گی، اوس نے اندرونیقوس
کو یہ حکم بھی دیا کہ وہ اسکندریہ مین فلسفہ کی تعلیم کے لئے کسی کو اپنا جانشین مقرر کردے، اور
خود اس کے ساتھ روم کو چلے"،

اب فلسفہ کی تعلیم کے دو مرکز قرار پائے، ایک مرکز اسکندریہ مین، اور دوسرا روم مین قائم
ہوا، اس کے بعد عیسائیت کا دور آیا، تو روم مین فلسفہ کی تعلیم کا خاتمہ ہوگیا، لیکن وہ اسکندریہ مین بدستور
باقی رہی، اب عیسائی بادشاہ نے پادریون سے مشورہ کیا کہ اس تعلیم کا کون سا حصہ باقی رکھا جائے
اور کس کو مٹا دیا جائے، پادریون نے رائے دی کہ آخری اشکال وجودیہ تک تو منطق کی تعلیم دیجائے لیکن
بعد منطق کے جو حصے ہین، ان کی تعلیم نہ دیجائے، کیونکہ اس سے عیسائیت کو نقصان پہنچے گا، اس کے علاوہ
انھون نے جس حصہ کے تعلیم کی اجازت دی، اوس سے عیسائیت کی تائید وحمایت ہوتی تھی،
مسلمانون کے دور حکومت سے پہلے صرف اسی قدر تعلیم جاری تھی، اس کے بعد مسلمانون کا دور حکومت
شروع ہوا، تو تعلیم کا مرکز اسکندریہ سے انطاکیہ مین منتقل ہوگیا، جو مدتون قائم رہا، یہان تک کہ آخر مین
وہان صرف ایک معلم باقی رہ گیا، جس سے دو شخصون نے تعلیم حاصل کی، ان مین ایک حران کا، اور دوسرا
مرو کا باشندہ تھا، یہ دونون تعلیم پا کر اور کتابون کا ذخیرہ لے کر نکلے، تو مرو کے باشندے سے دو شخصون
یعنی ابراہیم مروزی اور یوحنا بن حیلان نے اور حران کے باشندے سے اسرائیل اسقف اور قویری نے

تعلیم حاصل کی، اس کے بعد یہ دونون بغداد مین آئے، اور ابراہیم مذہبی کامون مین اور قویری تعلیم مین مشغول ہوگئے،

یوحنا بن جیلان نے بھی مذہبی مشغلہ اختیار کیا، لیکن ابراہیم مروزی نے بغداد مین قیام کیا اوران سے متی بن یونان نے آخر اشکال وجودیہ تک کی تعلیم حاصل کی، کیونکہ اس وقت تک یہین تک کی تعلیم کا رواج تھا، خود فارابی نے یوحنا بن جیلان سے کتاب البرہان آخر تک پڑھی، لیکن اس کے بعد اشکال وجودیہ کے بعد جو جزو چھوڑ دیا گیا تھا، اس کی تعلیم کا بھی رواج ہوگیا، اس کے بعد مسلمان اساتذہ کا زمانہ آیا، تو اشکال وجودیہ کے بعد آدمی جس قدر چاہے پڑھ سکتا تھا،[1]

اس تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرق یعنی بغداد وغیرہ مین یونانی فلسفہ و منطق کی تعلیم کا سلسلہ ارسطو اور اس کے تلامذہ کی کتابون سے شروع ہوا، اور ابتدا مین اس کی تعلیم صرف عیسائی دیتے تھے لیکن بعد کو مسلمانون مین جن لوگون نے فلسفہ کی تعلیم حاصل کی، اُن مین سب سے نمایان شخص فارابی تھا، اور فارابی نے فلسفہ و منطق پر جو کچھ لکھا تھا، اوسی کو ابن سینا نے شفا مین نقل کر دیا، اور اسی کی کتابون سے مشرق مین فلسفہ و منطق کا رواج ہوا، اگرچہ بعض لوگ فارابی اور قدما کی کتابون سے خاص طور پر دلچسپی رکھتے تھے، اور بہت سے لوگ شیخ الاشراق کے ساتھ شدت کے ساتھ اعتقاد رکھتے تھے، لیکن عام طور پر لوگ صرف ابن سینا کے معتقد تھے، اور ان کا خیال تھا کہ فلسفہ و حکمت کا جامع صرف ابن سینا تھا، اور اس نے فلسفہ و حکمت کا تمام ذخیرہ اپنی کتابون مین جمع کر دیا ہے،[2] اس لئے مشرق مین فلسفہ کی اشاعت ابن سینا کی تصنیفات سے ہوئی، جو فلسفہ ارسطو کا سب سے بڑا شارح تھا،

تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کے علاوہ فلسفہ کی اشاعت کا ایک بڑا ذریعہ یونانی

[1] طبقات الاطبا، جلد دوم ص ۱۳۵-۱۳۴، [2] ایضاً ص ۲۰۴، ۲۰۶،

کتابون کے تراجم کا تھا، جس کے تین دور ہین،

۱- پہلا دور جو خلیفہ منصور کے زمانہ سے شروع ہو کر ہارون رشید کے زمانے پر ختم ہوا، اور اس دور مین صرف اخلاق، ہیئت، منطق، اور طب کی کتابون کے ترجمے ہوئے،

۲- دوسرے دور مین جو مامون کے زمانہ سے شروع ہوا، تمام یونانی علوم و فنون کے ترجمے ہوئے،

۳- تیسرے دور مین جو چوتھی صدی ہجری تک قائم رہا، ارسطو کی منطق اور طبعیات کی کتابون کے ترجمے ہوئے، اور ان کی شرحین اور تفسیرین لکھی گئین، اسی تیسرے دور کے بعد مسلمانون مین فلسفہ یونانی کی اشاعت ہوئی، اس لئے قدرتی طور پر مشرقی مسلمانون مین فلسفہ ارسطو کا عام رواج ہوا،

مغرب یعنی اندلس وغیرہ مین بھی فلسفہ کی اشاعت اہل مشرق ہی کے ذریعہ سے ہوئی، جن مین پہلا شخص بغداد کا ایک مشہور طبیب اسحق بن عمران تھا، جو زیادۃ اللہ بن الاغلب التمیمی کی دعوت پر افریقہ گیا، اور مغرب مین اسی کے ذریعہ سے طب اور فلسفہ کی اشاعت ہوئی،[1] پھر تیسری صدی کے وسط مین محمد عبدالرحمن الحکم بن ہشام بن عبدالرحمن الداخل کے زمانہ مین چند افراد مین علمی تحریک شروع ہوئی، اور یہ تحریک چوتھی صدی کے وسط تک جاری رہی، اور اس دور مین جن لوگون نے علوم حکمیہ کی طرف توجہ کی، ان مین ابو عبیدہ مسلم بن احمد اور قاسم بن موسیٰ نے جو مغربی تھا، مشرق کا سفر کیا تھا؛[2]

لیکن اسپین مین علوم حکمیہ کی اصلی ترقی چوتھی صدی ہجری کی ابتدا مین خلیفہ حکم المستنصر باللہ بن عبدالرحمن الناصر لدین اللہ کے زمانہ مین ہوئی، جس کو اپنے باپ کے زمانہ ہی سے علوم و فنون کی کتابون کے جمع کرنے کا شوق تھا، اور بغداد، مصر اور مشرقی ممالک سے علوم قدیمہ و جدیدہ کی عمدہ عمدہ کتابین منگوا کر ایک کتب خانہ مین جمع کی تھین، اس کے بعد اپنے دور حکومت مین اس کتب خانے مین اس قدر اضافہ کیا کہ صاعد اندلسی کے بیان کے مطابق خلفائے عباسیہ نے جس قدر کتابین ایک طویل

[1] طبقات الاطبا، جلد دوم ص ۳۵، ۳۷، [2] ایضاً ص ۶۴، ۶۵،

زمانے مین جمع کی تھین، ان کے برابر کتابین اوس نے اپنے دورِ حکومت مین جمع کرلین، اس لئے اوس کے زمانہ مین لوگون مین فلسفیانہ کتابون کے مطالعہ اور تعلیم وتعلم کا بہت زیادہ شوق پیدا ہوا، اور فلسفیون کا ایک بہت بڑا گروہ پیدا ہوگیا، لیکن اس کے بعد ۳۶۶ھ مین جب حکم کا انتقال ہوگیا، اور اس کا نابالغ لڑکا ہشام اس کا جانشین ہوا، تو اس کی صغر سنی کی وجہ سے عنانِ حکومت اس کے حاجب ابو عامر محمد بن عبداللہ کے ہاتھ مین آگئی، اور چونکہ عام طور پر اندلس مین فلسفیانہ علوم کا رواج نہ تھا، اور جو لوگ ان علوم کی تعلیم حاصل کرتے تھے، وہ ملحد اور بے دین سمجھے جاتے تھے، اس لئے اُس نے عوام مین ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لئے حکم کے کتب خانے کی تمام فلسفیانہ کتابین جلوا دین، اس لئے حکم کے زمانہ مین جو فلسفیانہ تحریک پیدا ہوگئی تھی وہ دفعۃً رک گئی، اور صرف چند لوگ رہ گئے، جنھون نے مخفی طور پر اس سرمایہ کو محفوظ رکھا، اس کے علاوہ حکم کی جمع کردہ فلسفیانہ کتابون کا جو ذخیرہ برباد کیا گیا، اس مین سے کچھ کتابین نادانستہ طور پر بچ رہی تھین، اس لئے جب اندلس مین بنوامیہ کی حکومت کے خاتمہ کے بعد پانچوین صدی کی ابتدا مین جب طوائف الملوکی پیدا ہوئی تو قرطبہ کے شاہی محل مین کتابون اور دوسرے سامانون کا جو ذخیرہ تھا وہ نہایت ارزان قیمت پر فروخت کیا گیا، اور انھی مین وہ فلسفیانہ کتابین بھی تھین جو ابنِ عامر کے زمانہ مین باوجود تلف کرنے کے بچ رہی تھین، اس لئے یہ کتابین اندلس مین پھیلین، اور رفتہ رفتہ اُن کے ذریعہ سے پھر اندلس مین فلسفیانہ مذاق پیدا ہوچلا[1]، اور متعدد فلسفی پیدا ہوگئے، جن مین سب سے زیادہ نامور ابن باجہ، ابن طفیل اور ابن رشد تھے، ان مین سب سے مقدم ابن باجہ تھا جس نے ۵۳۳ھ اور ایک روایت کے مطابق ۵۲۵ھ مین وفات پائی، اس کے متعلق علامہ ابن ابی اصیبعہ طبقات الاطبا مین لکھتے ہین کہ اندلس مین اگرچہ خلیفہ حکم ہی کے زمانہ مین فلسفہ کی کتابین عام طور پر شائع شائع ہوگئی تھین، لیکن ایک مدت تک کسی نے ان سے صحیح طور پر فائدہ نہین اٹھایا،

[1] طبقات الامم ص ۶۴،

صرف دو شخص ایسے پیدا ہوئے، جنھون نے فلسفیانہ علوم سے صحیح طور پر فائدہ اٹھایا، ایک مالک بن وہب الاشبیلی، دوسرا ابن باجہ، لیکن چونکہ اب تک ان علوم کو اندلس مین عام حسنِ قبول حاصل نہین ہوا تھا، اور عوام فلسفیون کی جان کے دشمن ہو جاتے تھے، اس لئے مالک بن وہب الاشبیلی ان خطرات کی وجہ سے فلسفیانہ علوم سے دستبردار ہوکر علومِ دینیہ کی خدمت مین مشغول ہوگئے، اور فلسفیانہ علوم پر بہت کم لکھا، لیکن ابنِ باجہ عمر بھر تصنیف و تالیف مین مشغول رہا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارابی کے بعد ان علوم مین اوس کا کوئی ہمسر نہین پیدا ہوا،[1]

مشرق سے حکم نے فلسفیانہ کتابون کا جو ذخیرہ منگوا کر جمع کیا تھا، اس مین زیادہ تر ارسطو کی کتابین تھین، اس لئے ابن باجہ نے ارسطو ہی کی کتابون کی شرح لکھی،

ابن طفیل چھٹی صدی ہجری کی ابتدا مین پیدا ہوا، اور ۵۸۱ھ مین بہ مقام مراکش وفات پائی، اور وہ ایک روایت کے مطابق ابن باجہ کا شاگرد تھا،[2]

ابن رشد ۵۲۰ھ مین پیدا ہوا، اور ۵۹۴ھ مین وفات پائی، اور ایک روایت کے مطابق وہ بھی ابن باجہ کا شاگرد تھا، اگرچہ یہ روایتین مشکوک ہین، تاہم اس مین شبہہ نہین کہ یہ تینون فلسفی ایک ہی زمانہ مین تھے، اور ان ہی تینون کے ذریعہ سے مغرب مین فلسفہ کی اشاعت ہوئی، اس موقع پر اس بات کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھنا چاہیے، کہ جن بادشاہون کے ذریعہ سے مشرق مین فلسفیانہ کتابون کی اشاعت ہوئی، ان مین کوئی بھی بذاتِ خود فلسفہ کا ماہر نہ تھا، خلیفہ ابوجعفر منصور، خلیفہ ہارون رشید، اور خلیفہ مامون رشید نے اگرچہ فلسفیانہ کتابون کے ترجمے شاہانہ فیاضی سے کرائے، لیکن ان مین کوئی بھی فلسفہ کا ماہر نہ تھا، اس کے بخلاف جن بادشاہون کے ذریعہ سے مغرب مین فلسفہ کی اشاعت ہوئی، وہ بذاتِ خود فلسفہ کے ماہر تھے، مثلاً حکم کے بعد فلسفہ کی اشاعت موحدین کی سلطنت مین ہوئی، اور

[1] طبقات الاطبا، جلد دوم ص ۶۳، [2] المعجب فی تلخیص اخبار المغرب ص ۱۷۲،

یوسف بن عبدالمومن نے جو خود فلسفہ کا ماہر تھا، خاص طور پر اس طرف توجہ کی، اور ابن طفیل کو جو اوس زمانہ کا بہت بڑا فلسفی تھا، اپنا مقرب خاص بنایا، اور ابن طفیل نے اس تقرب سے صرف ذاتی فائدہ ہی نہین اٹھایا، بلکہ عام اہل علم کو اس نے گوناگون فوائد پہونچائے، اندلس مین اب تک جو حکماء و فلاسفہ پیدا ہوئے تھے، ان کی کوئی اجتماعی حالت نہین پیدا ہوئی تھی، بلکہ وہ منتشر اور پراگندہ حالت مین زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن ابن طفیل نے ان کو اندلس کے گوشہ گوشہ سے بلا کر یوسف بن عبدالمومن کے دربار مین جمع کر دیا، اور اوس کو ان کی قدردانی پر آمادہ کیا، اور اس طرح گویا فلسفہ و حکمت کی شیرازہ بندی کی، یوسف بن عبدالمومن نے فلسفہ کی سب سے بڑی خدمت یہ انجام دی کہ ابن طفیل کو ارسطو کی کتابون کی تشریح و تلخیص کی طرف توجہ دلائی اور دور جدید کے بعض مورخین کا خیال ہے کہ چونکہ مشرق مین مامون رشید کو فلسفۂ ارسطو کی اشاعت کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی تھی، اس لئے یوسف بن عبدالمومن نے بھی مغرب مین وہی درجہ حاصل کرنا چاہا جو مشرق مین مامون رشید کو حاصل تھا،

بہرحال ارسطو اور اس کے مترجمین کی عبارتون مین جو اضطراب و ناہمواری تھی، یوسف بن عبدالمومن نے ابن طفیل سے اوس کی شکایت کی، اور اس کے اغراض و مقاصد کی پیچیدگی کا تذکرہ کیا، اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر ان کتابون کو اچھی طرح سمجھ کر کوئی ان کی تلخیص کر کے اُن کو قریب الفہم بنا دیتا تو لوگ آسانی کے ساتھ اُن سے فائدہ اٹھا سکتے تھے، ابن طفیل اگرچہ خود اپنی پیرانہ سالی اور سرکاری کامون کی مشغولیت کی وجہ سے اس خدمت کو انجام نہ دے سکا، تاہم اوس نے یوسف بن عبدالمومن کے دربار مین جو فلسفی جمع کر دیئے تھے، ان مین سب سے ممتاز ابن رشد تھا، اور ابن طفیل کے اشارے سے وہ ارسطو کی کتابون کی تلخیص پر آمادہ ہو گیا،[1]

اس تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ اوس کو ارسطو کی کتابون پر عبور حاصل تھا، اس کے علاوہ

[1] المعجب فی تلخیص اخبار المغرب ص ۱۷۵،

ابن رشد اوس کے دربار مین جس طرح پہنچا ہے، اور اس نے جس طرح ابن رشد سے گفتگو کی ہے، اوس سے بھی اوس کی فلسفہ دانی ظاہر ہوتی ہے، خود ابن رشد کا بیان ہے کہ اس نے سب سے پہلے مجھ سے اس طرح گفتگو شروع کی کہ آسمانون کے متعلق فلسفیون کی کیا رائے ہے؟ وہ قدیم ہین یا حادث؟ ابن رشد نے شرم و خوف سے اس کا کوئی جواب نہین دیا، تو خود یوسف بن عبدالمومن نے ابن طفیل کی طرف متوجہ ہو کر اس مسئلہ پر گفتگو شروع کی، اور ارسطو، افلاطون اور تمام فلاسفہ کے اقوال، اور اُن کے ساتھ اہل اسلام کے اعتراضات بھی بیان کئے، ابن رشد کا بیان ہے کہ مین نے اس مین حفظ کی وہ کثرت دیکھی، جو ان لوگون مین بھی موجود نہ تھی، جو صرف فلسفہ ہی کے ہو رہے تھے،[1]

اس طرح مشرق و مغرب دونون مین عام طور پر صرف فلسفۂ ارسطو کی اشاعت ہوئی، کیونکہ مشرق مین زیادہ تر فلسفیانہ کتابون کی اشاعت مامون رشید کے زمانہ مین ترجمون کے ذریعہ سے ہوئی، جن کو مختلف مترجمین نے کیا، اور غالباً ایک ہی کتاب کے مختلف ترجمے کئے گئے تھے، لیکن یہ ترجمے جیسا کہ اوپر گذرا، غیر واضح اور باہم مختلف تھے، اور فارابی نے ان کو جمع کر کے ایک کتاب تیار کی، جس کا نام تعلیم ثانی تھا، اور شیخ بو علی سینا نے سلطان مسعود کے زمانہ مین اسی کی تلخیص شفا مین کر دی، جس کے ذریعہ سے مشرق مین صرف فلسفۂ ارسطو کی اشاعت ہوئی، مغرب مین فلسفیانہ کتابون کا جو ذخیرہ پہونچا، وہ تمام تر مشرق ہی سے آیا تھا، اس لئے قدرتی طور پر وہان بھی فلسفۂ ارسطو ہی کا رواج ہوا، سب سے پہلے ابن باجہ نے ارسطو کی کتابون کی تشریح کی، اس کے بعد یوسف بن عبدالمومن کے زمانے مین فلسفۂ ارسطو کی تشریح ابن رشد نے کی اور اسکی تمام پیچیدگیان دور کر دین، اس لئے مغرب مین بھی اسی فلسفہ کا رواج ہوا، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہین نکلتا کہ مسلمان یونان کے دوسرے حکما کے خیالات و نظریات سے بالکل ناواقف تھے، بلکہ اس کے بخلاف یہ نتیجہ نکلتا ہو کہ مسلمانون نے یونان کے اور حکما کو چھوڑ کر صرف فلسفۂ ارسطو کی طرف جو توجہ کی اسکے خاص اسباب تھے، ورنہ وہ دوسرے حکما کے خیالات و نظریات سے بھی واقف تھے، جیسا کہ اس مضمون کے تیسرے نمبر سے معلوم ہوگا،

(باقی)

[1] المعجب فی تلخیص اخبار المغرب ص ۱۷۴،

اردو شہ پارے

کی

چند قابلِ توجہ فروگذاشتیں

از

ڈاکٹر نذیر احمد لکچرر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی

ڈاکٹر غلام محی الدین قادری زور، عبد الجبار خان، نصیر الدین ہاشمی وغیرہ نے دکھنی زبان کے کارناموں کو اجاگر کرنے میں جس قدر کاوش کی ہے، اُس سے جوشِ عمل بیدار ہوجاتا ہے، لیکن کسی تحقیقات میں فروگذاشتیں باقی رہ جانا بعید از قیاس نہیں، چنانچہ اردو شہ پارے جلد اول (تالیف ڈاکٹر زور) میں ابراہیم عادل شاہ ثانی (متوفی ۱۰۳۷ھ) اور محمد عادل شاہ (متوفی ۱۰۶۷ھ) کے عہد کے ادبی کارناموں کے ضمن میں کچھ اہم غلطیاں رہ گئی ہیں، جن کی تصحیح ضروری ہے، اس کے ۱۴ سال بعد ڈاکٹر صاحب مذکور نے تذکرہ اردو مخطوطات شائع کیا، مگر اس میں بھی وہی فروگذاشتیں پائی جاتی ہیں، اس لئے ذیل کے اوراق میں اُن کے متعلق کچھ عرض کیا جاتا ہے، قارئین کرام سے عموماً اور متعلق حضرات سے خصوصاً درخواست ہے کہ وہ اس مقالے کو جو محض علمی و ادبی خدمت کی بنا پر سپردِ قلم ہوا ہے، کسی دوسرے جذبہ پر محمول نہ کریں گے،

ابراہیم عادل شاہ کے درباری علماء و شعراء کے بارے میں یہ اطلاع ملتی ہے، (ص ۳۴)

"بڑے بڑے شعراء اور مصنفین جن میں ملا ظہوری، ملا باقر، ملک قمی، عبد القادر نورسی شامل ہیں اس کے دربار میں موجود تھے، علماء میں رشید ابتگی مولانا حیدر ذہنی، میرزا مقیم آتشی کے

نام قابلِ ذکر ہیں،"

عبد القادر نورسی کی شخصیت غیر معروف ہے، اگرچہ بساتین السلاطین[1] وغیرہ تاریخوں میں اس کا ذکر ہے، لیکن فارسی شعراء کے کسی تذکرہ میں اس کا نام نہیں ملتا، خود محبوب الزمن (تالیف عبد الجبار خان) اس کے ذکر سے خالی ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ نورسی کی شاعری مقبولِ عام نہ تھی، اس لحاظ سے اس کو ظہوری اور ملک جیسے بلند پایہ شاعروں کے زمرہ میں شامل کرنا صحیح نہیں، نورسی کے بجائے ملا فہمی[2] کا بھی تذکرہ ضروری تھا، جس نے ۱۰۱۱ھ میں شاہ نواز خان کے فرزند کی پیدائش کے موقع پر قصیدہ پیش کیا تھا، اسی عہد کا ایک مشہور شاعر رشیدائے نورس قزوینی ہے، تمام فارسی شعراء کے تذکروں میں اس کا حال درج ہے، محبوب الزمن[3] میں اس کا تذکرہ موجود ہے، مگر غلطی سے اس کو عادل شاہ ثانی کے عہد کا شاعر بتایا گیا ہے، حالانکہ عرفات العاشقین[4] میں اس کا ذکر ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ابراہیم عادل شاہ ہی سے متعلق تھا، اور دوسرے تمام تذکروں[5] سے عرفات ہی کی تائید ہوتی ہے،

---

[1] دیکھو ص ۲۵۰، عبد القادر نورسی کہ شاعرے فصیح بود [2] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۱۰۲، مولانا فہمی کہ مداح خانِ والا مکان است، اس کے قصیدہ کے دس شعر فرشتہ نے درج کئے ہیں [3] ج ۲ ص ۱۰۱-۸۸، بقولِ مؤلف ۱۰۱۶ھ میں وطن سے شہر بیجاپور پہنچا، شہنواز خان کے توسل سے علی عادل کے دربار میں رسائی ہوئی، خواجہ سعد الدین عنایت اللہ کی شخصیت بہت معروف ہے، جو ابراہیم عادل شاہ کے زمانہ میں وزیر الممالک تھا (فرشتہ جلد ۲ ص ۷۷، ۸۳)، اس کا تعلق علی عادل سے نہیں ہو سکتا [4] یہ تذکرہ ۱۰۲۲ھ ہجری میں مکمل ہوا، اور اس سنہ سے قبل اس کا انتقال ہو چکا ہے، ملاحظہ ہو:

"درین نزدیکی بود وجودش بباد فنا رفتہ" (ورق ۱۸۷)

[5] مثلاً دیکھو مجمع النفائس ورق ۹۴ الف جہاں اس کے متعلق ہے:-

"ظاہرا تخلص مذکور از آں جہت اختیار کردہ کہ ابراہیم عادل شاہ بیجاپوری نورس بسیار خوش داشت"

حیدر ذہنی، میرزا مقیم، اور آتشی کو علماء کے ساتھ شامل کرنا زیادہ صحیح نہیں، حیدر ذہنی کاشانی[1] بڑا خوش فکر شاعر ہے، قصیدے بہت ہی کم لکھے، البتہ غزل میں اس کا خاص مرتبہ ہے، گنجفہ، نرد وغیرہ اس کے خاص مشاغل تھے، تقی کاشی لکھتا ہے[2]:-

"در اوائل ایام صبی بہ تحصیل فنِ شعر مشغول گشت"،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسرے علوم کی جانب متوجہ ہونے کا غالباً اُس کو بہت کم موقع ملا ہوگا، بہر حال جب ہر جگہ اس کا ذکر بحیثیت شاعر کے ملتا ہے، تو پھر ڈاکٹر زور کا شاعروں کے زمرے سے الگ کرنا خلاف قیاس ہے،

اگرچہ میرزا مقیم کے ذکر سے فارسی شعراء کے تذکرے خالی ہیں، لیکن فتوحات عادل شاہی[3] اور بساتین میں[4] اُس کا ذکر شاعری کی حیثیت سے کیا گیا ہے، لیکن نہ معلوم کن وجوہ کی بنا پر ڈاکٹر زور نے اس کو شاعروں کی جماعت سے الگ کر دیا ہے، اس پر لطف یہ ہے کہ جب اس کا ذکر خود کرتے ہیں تو صرف اُس کی فضیلت شاعری کو پیش کرتے ہیں، اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ فزونی یعنی مولفِ فتوحات نے اُس کو عالم تو نہیں بلکہ شاعر بتایا ہے" ان کا یہ بیان بھی صحت سے دور معلوم ہوتا ہے، کیونکہ فزونی نے صرف ذیل کے بیان میں میرزا مقیم کی علمی فضیلت بتائی ہے، جس میں کہیں سے یہ مترشح نہیں ہوتا کہ وہ عالم نہ تھا[5]،

"ظاہر بہ انوار وجاہت آراستہ و باطن بہ آثار صدق و صفا پیراستہ در عنفوان شباب در ریعان جوانی کسب کمالات صوری و معنوی نمودہ و از مستعدان زمان است، رتبہ خط و پایۂ نظم را

[1] مجمع عرفات ورق ۲۳۵ الف، مجمع النفائس ورق ۱۴۰ الف، مخزن الغرائب ج ۱ ص ۲۶۵، باغ معنی ورق ۱۰۳ ب [2] خلاصۃ الاشعار حالات ذہنی کاشی مخطوطہ رامپور [3] از ص ۳۰۴ تا ۳۹۵ [4] بساتین ص ۲۳۵

[5] فتوحات ص ۳۰۴-۳۰۳-۳۸۵،

بہ اعلیٰ درجۂ کمال رسانیدہ و در طرز سلوک و آداب صحبتِ ملوک بے شبہہ و مانند است"،

بہر حال چونکہ اس کی شاعری اس کے دوسرے فضائل سے ممتاز تھی، اس لئے اس کا شمار شعراء میں کرنا چاہئے،

آتشی اگرچہ فنِ طب میں بہت کافی دستگاہ رکھتا تھا، اور فزونی کے بیان[1] کے بموجب:-

"درین سن (ریعان جوانی) تہذیب اخلاق و حسن سلوک را بدرجۂ اعلیٰ رسانیدہ اند و مراتبِ حکمت و معالجات را بجائے رسانیدہ اند کہ قصب السبق از اقران ربودہ اند"

اور اگرچہ اس کے بعض علاج بہت مشہور تھے، لیکن چونکہ بقول فزونی[2] مذکور،

"اکمال در اوائل جوانی اند، آنچہ از اشعار دل افروز ایشان بہ نظر این دعاگو رسیدہ یک لک و پنجاہ ہزار بیت می شود، از قسم غزل و قصیدہ و مثنوی و رباعی و اقسام خوش شعر در بحورِ مشکلہ"

اس لئے اس کا ذکر شعراء کے ساتھ کرنا مناسب تھا،

ڈاکٹر زور کی فہرست صرف اسی لحاظ سے ناقص و نامکمل نہیں، بلکہ اس میں دوسرے قسم کے بھی نقائص موجود ہیں، مثلاً آتشی و مقیم جن کو ابراہیم عادل کے عہد کا شاعر بتایا گیا ہے، وہ دراصل اس کے بیٹے محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۷ھ) سے متعلق تھے، جیسا کہ آیندہ عرض کیا جائے گا،

مولف اردو شہ پارے رقمطراز ہیں،

"ابراہیم اردو کا زبردست سرپرست تھا، چنانچہ جب اپنا دار السلطنت تبدیل کیا[3] تو اس نے خود اس کا اور محلوں، باغوں، گلی کوچوں کے خالص اردو نام تجویز کئے"، (ص ۳۵)

[1] فتوحات عادل شاہی ص ۹، ۳ [2] ایضاً [3] اگرچہ بادشاہ ۱۰۰۸ھ میں شہر نورس پور کی بنیاد ڈال کر بیجاپور کی رونق میں کچھ کمی ضرور کر دی تھی، لیکن دار السلطنت اس کا بیجاپور ہی تھا، چونکہ نیا شہر بادشاہ کو

اس بیان مین دارالسلطنت کی تبدیلی سے شہر نورس پور کی تعمیر مراد ہے، جس کی بنا ۱۰۰۸ھ ہجری مین ڈالی گئی، لیکن ڈاکٹر زور نے اس شہر کے گلی کوچون کے نام نہیں لکھے، جس سے اندازہ لگایا جاتا کہ اُن کے خالص اردو نامون کی کیا نوعیت تھی، جب نورس پور کی بنیاد ڈالی جا رہی تھی، تو ایک شخص نے بادشاہ کو ایسی شراب پلائی کہ وہ بہت لطف اندوز ہوا، اور اُس کے امروز مارا کیفیت نورسیدہ کے فقرے نے شراب کو نورس کے نام سے ممتاز کیا، اسی نسبت سے شہر کا بھی نام یہی تجویز ہوا، اور مختلف چیزین محل نورس، نشان نورس، سکہ نورس، عید نورس وغیرہ نامون سے موسوم ہوئین، بعض شاعرون

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳۹) بہت پسند تھا، خصوصیت کے ساتھ نورس محل مین بادشاہ کا بیشتر قیام رہتا، لیکن اس سے یہ قیاس ہرگز درست نہین ہو سکتا، کہ اس نے نئے شہر کو دارالسلطنت بھی قرار دے دیا تھا، چنانچہ ہم عصر شاہی مورخ و رکن سلطنت شاہ رفیع الدین شیرازی کے حسب ذیل بیانات سے اس قیاس کی پوری تائید ہوتی ہے :-

(۱) در تاریخ یک ہزار و ہفدہ سال ہجری در شہر رمضان المبارک در دارالسلطنت بیجاپور کہ الحال بہ بیدا پور اشتہار یافتہ شروع در مسودۂ این اوراق شد، (ص ۱۶)

(۲) ذکر تغیر نام دارالسلطنت بیجاپور بہ بیدا پور (۱۰۱۲ھ ہجری) (تذکرۃ الملوک ص ۳۴۰)

(۳) دارالسلطنت بیجاپور کہ در تاریخ یک ہزار و دوازدہ بہ بیدا پور موسوم ساختند (ایضاً ص ۳۴۹)

فرشتہ کے بیان کے مطابق شاہ نواز خان نے ربیع الثانی ۱۰۱۰ھ کے کچھ قبل اپنی فلک بوس عمارت بادشاہ کے حکم سے بیجاپور ہی مین بنوائی تھی، جس کے ایک حصہ عمارت کا نام نورس بہشت تھا (جلد ۲ ص ۸۲، ۸۳)

۱ بیجاپور ارکیٹیکچر کے مؤلف بھی ڈاکٹر زور کی طرح نورس پور ہی کو دارالسلطنت قرار دیتے ہین،

۲ و ۳ تذکرۃ الملوک ص ۳۴۰، بساتین السلاطین ص ۲۴۹ و صفحہ ۲۵۰ و فتوحات عادل شاہی ص ۱۵۰ تا ۱۶۱،

۴ مثلاً عبدالقادر نورسی در شید نورس،

نے اپنا تخلص نورس قرار دیا، اور بعض مصنفین[۱] نے اسی نام سے کتابین لکھین، اور اس نام کی مقبولیت کا عالم یہ ہوا کہ ابراہیم عادل، شاہ نورس کے لقب سے موسوم ہوا، ممکن ہے نورس کی عام مقبولیت سے ڈاکٹر زور نے یہ اندازہ کیا ہو کہ نورس پور کے گلی کوچون کے یہی نام ہون گے، اس سلسلہ مین یہ عرض ہے کہ لفظ نورس کا جتنا تعلق اردو (ہندی یا دکنی) سے ہے، اس سے زیادہ فارسی سے ہے، کیونکہ ظہوری نے اس کے تین ماخذ بتائے ہین، نورس (بہ معنی نوشیرہ) نورسیدہ، اور نورس (نہال نوشگفتہ) ان مین سے آخری دو فارسی کے ہین، اور رفیع الدین نے تو اس لفظ کو صرف نورسیدہ کی طرف منسوب کیا ہے، اس ضمن مین مزید یہ عرض ہے کہ رفیع الدین نے لکھا ہے کہ نورسیدہ کے فقرات بادشاہ کی زبان سے ۱۰۰۸ھ ہجری کے بعد نکلے، اور یہی تاریخ فتوحات عادل شاہی اور بساتین السلاطین دونون مین اختیار کی گئی، لیکن یہ فقرے اس سے قبل وجود مین آچکے تھے، کیونکہ بادشاہ کی کتاب جو نورس ہی کے نام سے موسوم ہے، اس سنہ سے قبل ہی لکھی جا چکی تھی، اس کا ثبوت یہ ہے کہ ظہوری کے دیباچۂ گلزار ابراہیم مین (جو دیباچۂ نورس سے موخر ہے اس بنا پر کہ اس مین آخر الذکر کا ذکر موجود ہے) ذیل کی عبارت پائی جاتی ہے،

(۹)

"سال و ماہ عمر ابد پیوندش در سیر خیابان عشرۂ سوم"،

اس مین ش کا مرجع ابراہیم عادل شاہ ہے، جس کی عمر تیس سال سے کم تھی، چونکہ اس کی

۱ مثلاً خود بادشاہ کی تصنیف اسی نام سے موسوم ہوئی، تاریخ فرشتہ کے دو نام ہین، گلشن ابراہیمی و نورس [illegible]

۲ دیکھو کلیات ظہوری (مخطوطہ رامپور) ص ۴۹، و دیوان غزلیات (مطبوعہ ص ۱۱، ۴۸، ۸۹، ۲۲۱، ونیز کلیات ملک (مخطوطہ سوسائٹی) ورق ۷، الف ۳ سہ نثر مطبوعہ ص ۱۶ (دیباچۂ نورس) ۴ تذکرۃ الملوک (قلمی) ص ۳۵۲ ۵ ص ۱۵۰، ۶ ص ۲۴۹، ۲۵۰ ۷ کلیات قلمی (نسخہ رامپور) ص ۱۴۸ (دیباچۂ گلزار ابراہیم) ۸ ایضاً،

پیدائش ۹۷۹ھ[4] میں ہوئی، اس اعتبار سے دیباچہ گلزار ابراہیم ۱۰۰۹ھ کے قبل لکھا گیا ہوگا، اور اس سے بہت قبل کتاب نورس اور دیباچہ نورس کی تکمیل ہوئی ہوگی،

ظہوری نے دیباچہ نورس میں لفظ نورس کو نورسیدہ سے ماخوذ بتایا ہے، اس سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ فقرے [illegible]ھ سے قبل جاری ہوئے،

کتاب نورس میں نغمۂ نورس کا ذکر ہے، ظاہر ہے کہ اس نغمہ کا نام نورس پور کی بنا کے قبل رکھا جا چکا تھا،

نورس پور کے سلسلہ میں صرف دو نام ایسے ہیں[5] جن میں مقامی رنگ پایا جاتا ہے، ایک آشر بازار، دوسرا مانک چوک، اول الذکر وہ بازار تھا جو نورس پور کو بیجاپور سے ملاتا تھا، مانک چوک داستہ بازار کے درمیان ایک چھوٹے بازار کا نام تھا، ممکن ہے کہ ڈاکٹر زور کی نظر سے یہ نام گزرے ہوں لیکن بظاہر ان ناموں میں اردو دوستی کا کوئی خاص راز مضمر نہیں معلوم ہوتا،

اردو شہ پارے میں مؤلف لکھتے ہیں،

"ابراہیم عادل نے اردو زبان کی جو سب سے اعلیٰ خدمت انجام دی ہے، اور جس کی وجہ سے اس کا نام اردو کے محسنوں کی فہرست میں سب سے اول آتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس نے گجراتی شاعروں اور عالموں کو بیجاپور میں آ بسنے کی دعوت دی" (ص ۳۵)

اس کے بعد مؤلف نے گجرات میں اردو کی نشو و نما کے اسباب بتائے ہیں، اور فرید یہ لکھا ہے کہ اکبر کے یکایک حملے نے اس بساط کو الٹ دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء و شعراء پریشان ہو گئے، ایسے نازک موقع پر ابراہیم نے نہایت عقلمندی اور فیاضی کا کام کیا، اس نے اپنے

---

[4] مثلاً دیکھو فتوحات عادل شاہی (قلمی)، ص ۲ جہاں تخت نشینی کے وقت یعنی ۹۸۸ھ ہجری میں بادشاہ کی عمر ۹ سال کی بتائی ہے [5] تذکرۃ الملوک ص ۲۴۹،

آدمیوں کو بیش بہا تحائف دے کر گجرات روانہ کیا، تاکہ وہاں کے علماء و شعراء کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دیں، چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد گجرات کی ادبی عظمت کے پرچم کو بیجاپور میں لہراتا ہوا دیکھتے ہیں .... ان گجراتیوں کا اثر یہ ہوا کہ بعض دکھنی مصنفین بھی گجراتی آمیز زبان کو گجری کے نام سے موسوم کرنے لگے" (ص ۳۵)

اس سلسلے میں ذیل کے معروضات قابل توجہ ہیں،

(۱) گجرات کی آزاد اسلامی حکومت کا زوال ۹۸۰ھ میں اکبری عہد[1] کے اٹھارہویں سال رونما ہوا، اس سے ظاہر ہے کہ اس واقعہ کا تعلق ابراہیم عادل شاہ سے جو ۹۸۸ھ میں صرف ۹ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، ثابت نہیں ہو سکتا، ڈاکٹر زور بھی زوال حکومت گجرات[2] اور بادشاہ مذکور کی تخت نشینی میں ۸ سال کا وقفہ بتاتے ہیں، جس حملے کا ذکر ڈاکٹر زور نے کیا ہے، وہ سوائے اس حملے کے جس میں مغلی فوجوں نے گجرات پر قبضہ کر لیا، اور کوئی دوسرا مراد نہیں ہو سکتا، حالانکہ اس کے بعد بھی گجرات میں فتنے اٹھا کئے، اور اکبر کو بار بار فوجیں بھیجنا پڑیں، مگر ڈاکٹر زور کا اشارہ ان میں سے کسی کی طرف نہیں، اس بنا پر ان کا قیاس صحت سے دور معلوم ہوتا ہے، البتہ اتنا واقعہ ہے کہ دلاور خان نے اپنے زمانۂ وزارت (۹۹۰ھ – ۹۹۰ھ) میں نہ صرف گجرات کے علماء کو بیجاپور میں بسنے کی دعوت دی، بلکہ لاہور اور دوسرے مقامات سے بھی بلوایا تھا، مگر بساتین[3] کے ذیل کے جملے سے ظاہر ہوتا ہے، کہ وہ علماء صرف مذہبیات سے متعلق تھے :-

---

[1] دیکھو اکبرنامہ جلد سوم ص ۲۳ "حراست آن سرزمین بہ خان اعظم میرزا کوکہ تفویض یافت"، میرزا کوکہ کی علم دوستی سے بعید نہیں کہ وہاں کے اکثر علماء اس کے سایۂ عاطفت میں آ گئے ہوں، نیز دیکھو فرشتہ ج ۲ ص ۲۳۳ "در سنہ ۹۹۱ھ میرزا عبدالرحیم شاہ مظفر را گریزانید و گجرات بتصرف اکبر بادشاہ درآمد" [2] اردو شہ پارے ص ۳۵ زوال کی تاریخ ۹۸۰ھ اور ابراہیم عادل شاہ کی تخت نشینی ۹۸۸ھ دی ہے [3] ص ۱۹۰،

(دلاور خان) بعضے از علمائے گجرات و لاہور وغیرہ را در سلک مجلسیان جمع نمودہ بود، با ایشان صحبت می داشت، و تحقیق مسائل فقہی می کرد و این جماعت تمام روز در دو تخانہ او بمطالعہ و مذاکرہ تفسیر کبیر وغیرہ و تفاسیر و حدیث و فقہ اشتغال می داشتند"

دلاور خان نے یہ سب کچھ اس لئے کیا تھا کہ وہ حنفی مذہب کو بیجاپور کا سرکاری مذہب قرار دینے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا چنانچہ انہی کوششوں کی بنا پر یہ مذہب تقریباً ۷۰ سال تک یعنی ابراہیم اور محمد عادل دونوں کے زمانے میں پوری استقامت کے ساتھ رائج رہا،[1]

(ب) اگرچہ دعویٰ اس بات کا کیا گیا ہے کہ گجرات کا ادبی پرچم بیجاپور میں لہرا رہا تھا لیکن اسمیں فضلاء و شعراء کی جو فہرست دی ہے، اس میں کوئی بھی ایسا نہیں جس کا براہ راست تعلق گجرات سے تھا، ذیل کی صراحت سے یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو جائے گی :-

۱- محمد قاسم فرشتہ بیجاپور آنے کے قبل احمد نگر میں مرتضیٰ نظام شاہ دیوانہ (۹۷۲ھ تا ۹۹۶ھ)

---

[1] بعد استیلائے دلاور خان یعنی (۹۹۰ھ سے) تا ختم حکومت محمد عادل شاہ (یعنی ۱۰۶۶ھ تک) مذہب ابراہیم عادل کے لئے دیکھو بساتین ص ۱۹۰ (س-۳) ص ۲۷۸ (س-۱۲) ص ۲۸۱ (س-۱۷) درویش بادشاہ کو ولی عہد نہ بنانا محض اس وجہ سے تھا کہ وہ سُنّی نہ تھا، مثلاً مؤلف بساتین کہتا ہے،

"اگر بادشاہی بدو مسلم بود در سلطنت خانہ من ہمچو خانہ قطب شاہ رواج غریبان اجنبی و روافض خواہد شد" مزید دیکھو فرشتہ ج ۲ ص ۹۸، ۹۹)

محمد عادل شاہ کے حنفی ہونے کے لئے دیکھو بساتین ص ۳۲۷، جہاں اس کے عہد میں تراویح اور ختم قرآن کے شاندار انتظامات کا بیان ہے، مزید دیکھو محمد نامہ ص ۱۵۰، ۱۵۱، اور ص ۳۵۰ و ۳۵۱،

ان دونوں مقاموں پر صاف صاف بیان ہے کہ وہ گیسو دراز کے خاندان کا مرید تھا اور وہاں کے عرس میں اکثر شریک ہوتا تھا،

سے عرصہ تک متعلق تھا، اور وہاں سے ۱۰۰۵ھ میں وارد بیجاپور ہوا،

۲- رفیع الدین شیرازی ۱۰۲۰ھ تقریباً ۵۰ سال سے بیجاپور میں مقیم تھا، وہ صرف ابراہیم عادل شاہ ہی کا زلہ ربا نہ تھا، بلکہ اس کے پیشرو اور چچا علی عادل سے بھی منسلک تھا،

۳- ظہوری ۹۸۸ھ سے ۱۰۰۳ھ تک نظام شاہیوں کے دربار سے متعلق رہ چکا تھا، خانخانان کے حملۂ احمد نگر کے موقع پر بیجاپور کی طرف گیا، چنانچہ ۱۰۰۵ھ ہجری کے قبل وہ بیجاپور میں موجود پایا جاتا ہے،

۴- ملک قمی ۹۸۷ھ ہجری سے ۱۰۰۳ھ تک احمد نگر میں مسلسل مقیم تھا، جب خان خانان نے احمد نگر پر حملہ کیا، تو ملک کو براہ راست اپنے متوسلین میں شامل کرنا چاہا، مگر وہ حج کے بہانہ سے بیجاپور چلا گیا، ۱۰۱۲ھ کے قبل وہ ابراہیم عادل شاہ سے منسلک ہو چکا ہے،

۵- حیدر ذہنی ہندوستان میں آکر احمد نگر میں مقیم ہو گیا، اور خان خانان کے حملہ کے وقت وہ بھی بیجاپور کی طرف چل دیا، ۱۰۱۰ھ کے قبل وہ بھی بیجاپور میں موجود تھا،

۶- محمد باقر خرد، فردوس کاشی وطن سے برآمد ہو کر براہ راست تقریباً ۱۰۱۰ھ ہجری میں بیجاپور آکر ابراہیم عادل شاہ کے دربار سے متعلق ہو گیا،

۷- آتشی اور میرزا مقیم کا بھی قیام گجرات ثابت نہیں، فرزندی کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] فرشتہ ج ۱ دیباچہ ص ۴ [2] تذکرۃ الملوک ص ۱۴۳ میں ہے کہ ... سال ... کی عمر میں علی عادل شاہ کے زمانہ میں بیجاپور آیا، تالیف کتاب کے وقت ۷۰ سال کی عمر تھی،

[3] ابراہیم عادل شاہ سے متعلق بعض قطعات سے یہی سنہ برآمد ہوتا ہے، کلیات ورق ۲۶۹ الف

[4] ماثر رحیمی (قلمی) ورق ۹۰ الف [5] بعض قطعات سے یہی سنہ نکلتا ہے، مثلاً دیکھو کلیات ملک ورق ۹۷ الف، [6] فتوحات (بقیہ حاشیہ ص ۳۴۶ پر) .... فتوحات

وہ براہِ راست ایران سے آئے تھے،

ان کے علاوہ چند اور فضلاء کے بارے میں صراحت کی جاتی ہے :-

۸- سنجر کاشی بھی سندھ اور ہند[1] میں قیام کرنے کے بعد تقریباً ۱۰۱۳ھ[2] میں بیجاپور پہنچا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ وہاں پہنچنے کے قبل وہ احمد آباد (گجرات) میں اکبر اعظم کے حکم سے تقریباً ایک سال تک محبوس تھا، اور رہائی کے بعد[3] وہیں سے بیجاپور گیا، بہرحال چونکہ اس کا تعلق گجرات سے اس وقت محض ایک قیدی کا تھا، جب وہ ملک مغلیہ حکومت میں شامل ہو چکا تھا، اس لئے اس کی آمد سے ڈاکٹر زور کے مفروضے کی تائید نہیں ہوتی،

۹- ابو طالب کلیم کچھ عرصہ تک ابراہیم[4] عادل شاہ کے دربار میں رہ چکا ہے، جیسا کہ اس کے قصیدے سے جو بادشاہ کی مدح میں ہے، بخوبی ظاہر ہے، اس نے ملک قمی کی وفات (۱۰۲۳ھ ہجری) پر ایک تاریخی قطعہ کہا تھا، اس سے اس سنہ کے قریب اس کا قیام بیجاپور تقریباً یقینی ہے، مگر یہ بھی صریحی معلوم ہے کہ وہ شمالی ہند سے دکن گیا تھا،

۱۰- خواجہ سعد الدین عنایت اللہ[5] ابن خواجہ علاء الدین محمد شیرازی نے سید فتح اللہ شیرازی کی شاگردی میں حکمت اور ریاضی میں کمال حاصل کیا، علی عادل شاہ (متوفی ۹۸۸ھ ہجری) کی دعوت

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۵) عادل شاہی، (ص ۳۷۴) میں ہے، از جانب احمد نگر در فتح متولان بدار الخلافہ بیجاپور رسید[1] فرشتہ جلد دوم (اردو) ص ۲۰۲[2]، مآثر رحیمی (ورق ۱۲۱، الف) [3] فتوحات ص ۱۳۹ [4] مثلاً خود کہتا ہے :-

ہمی ندانی کز بعد نیم قرن خطا است / ز ہند و سند بایران شدن ندیدہ دکن

[2] صحف ابراہیم سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کی حکومت کے آخری سال بیجاپور پہنچا ہے، [3] مثلاً دیکھو مآثر رحیمی (ورق ۱۲۳) [4] شعر العجم جلد سوم (حالات کلیم) وغیرہ [5] فرشتہ ج ۲ ص ۳ ،

سید موصوف کی معیت میں بیجاپور آیا، چند دنوں بعد برہانپور، آگرہ، دہلی، اور لاہور وغیرہ کی سیر کر کے وطن مالوف لوٹ گیا، وہاں کچھ دنوں قیام کیا، پھر حج وغیرہ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد تکلیبی اصفہانی اور خواجہ عنایت اور ستانی کی رفاقت میں جرون اور چیول کی راہ سے ۹۹۶ھ ہجری میں دوبارہ بیجاپور واپس آیا، اور رئیس شاہی و خطاب شاہ نواز خان سے سرفراز ہو کر وزیر الممالک ہو گیا،

اس تفصیل سے صاف ظاہر ہے کہ عہد ابراہیم عادل کی معروف ہستیاں یا تو ایران سے آئیں یا احمد نگر سے، اس لئے ڈاکٹر زور کا قیاس کہ وہ لوگ گجرات میں مقیم تھے، اور وہیں سے بادشاہ مذکور کی دعوت پر بیجاپور آئے، قرین صحت نہیں،

ج :- ڈاکٹر زور نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کہ گجری زبان گجراتی اور دکھنی سے مل کر بنی ہے، اور اس کا ظہور حکومت گجرات کے زوال کے بعد (یعنی ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دورانِ حکومت میں ہوا) جہاں تک گجری زبان کا تعلق ہے، مجھے اس سے بحث نہیں، البتہ اس کے موضِ وجود کے آنے کے ضمن میں یہ عرض کرنا ہے کہ ڈاکٹر زور نے اپنے قیاس کی تائید میں شاہ برہان الدین جانم کی مثال پیش کی ہے، جو اپنی زبان کو گجری کہتے تھے، چونکہ شاہ مذکور کی وفات ۹۹۰ھ ہجری میں یعنی عہد ابراہیمی کے ابتدائی دو سال کے اندر ہی ہو چکی تھی، اس لئے ان کو اس عہد کے گجراتی لوگوں سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا ہوگا، اور یہ بات بھی قابل غور ہے، کہ شاہ جانم[1] کا انتقال حکومت گجرات کے بالکل خاتمے سے کچھ پہلے ہی ہوا تھا، غرض شاہ موصوف کی مثال سے جو نتیجہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے، وہ بے سود و لاحاصل ہے،

[1] شاہ برہان (متوفی ۹۹۰ھ) علی عادل شاہ اول کے زمانہ میں گذرے ہیں، ان کے والد شاہ میران جی عشاق (شمس العشاق) متوفی ۹۰۲ھ ہجری تھے

(دیکھو اردو شہ پارے ج ۱ ص ۳۲)

ڈاکٹر زور اردو شہ پارے مین لکھتے ہین :-

"ابراہیم عادل شاہ پہلا بادشاہ تھا جس نے اردو مین ایک لمبی نظم لکھی اس کا نام نورس ہے، اور موضوع موسیقی ہے، سہ نثر ظہوری اسی اردو کارنامے کے دیباچے کے طور پر لکھی گئی ہے، اور اس مین اس کے ابواب پر نہایت وضاحت کے ساتھ بحث کی گئی ہے،" (ص ۳۵)

اس سلسلے مین ذیل کے معروضات قابل غور ہین،

ا- اس مین تیرہ نہین کہ ابراہیم عادل شاہ سے قبل کسی مصنف کی کوئی باقاعدہ تصنیف دکھنی زبان مین اب تک نہین مل سکی، لیکن کتاب نورس کو غیر مشروط طور پر اردو کا کارنامہ سمجھنا غلط ہے کتاب مذکور ۱۰۰۶ھ سنہ ہجری کے قریب لکھی گئی، لیکن اس کے قبل کے جو دکھنی نمونے دستیاب ہوئے ہین ان سے اس کتاب کی زبان سخت تر ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی زبان کی دشواری قدامت کی بنا پر نہین ہے، بلکہ موضوع کی وجہ سے مصنف کو مجبوراً اس مین ایسی زبان اختیار کرنا پڑی، جس مین سنسکرت کے الفاظ کی کثرت اور غیر معروف الفاظ و فقرون خصوصاً اصطلاحات کی افراط ہو، یہی سبب ہوا کہ یہ زبان اس عہد کی مروجہ زبان سے الگ ہو گئی، اس پر ستم یہ ہوا کہ وہ فارسی رسم خط مین لکھی گئی، جس کی وجہ سے ایک طرف اس کی عبارت کا صحیح پڑھنا تک دشوار ہو گیا، مطلب و مفہوم سمجھنا درکنار، اور دوسری طرف اس کا شمار اردو زبان کی کتابون مین ہونے لگا، حالانکہ اگر وہ اس رسم خط مین نہ ہوتی، تو بعید نہین کہ اس کا شمار اردو مین کبھی نہ ہوتا، دیباچہ نورس[۱۱] سے پتہ چلتا ہے، کہ بادشاہ نے اہل ایران کے لئے اس کا ترجمہ فارسی مین کرایا تھا، لیکن یہ قیاس صحیح ہے کہ اس عہد کے لوگون کو اس ترجمے کے ذریعے اس کے مطالب کے سمجھنے مین آسانی ہوئی ہوگی، بظاہر اس وقت تک کتاب نورس ڈاکٹر زور کی نظر سے نہین گذری تھی، یہی وجہ ہے کہ وہ

---

[۱۱] دیباچہ نورس ظہوری و دیباچہ نورس ملک قمی (کلیات ملک ورق ۱۵۲ الف)

اس کا نام "نورس نامہ" قرار دیتے ہین، اور حیدرآباد مین اس کے قیمتی مخطوطات کی اطلاع نہ ہونے کی بنا پر اس کے نسخے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مخطوطہ مین بتاتے ہین،

اگرچہ زیر بحث تصنیف اکثر جگہون پر "نورس" کے عنوان سے مذکور ہوئی ہے لیکن فی الحقیقت اس کا نام کتاب نورس ہے، بظاہر ان تمام چیزون سے جو نورس کے نام سے موسوم تھین، ممتاز کرنے کے لئے لفظ کتاب کے اضافے کی ضرورت لاحق ہوئی، ذیل مین ظہوری اور ملک کے جملے نقل کئے جاتے ہین، جن مین اس کو "کتاب نورس" کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے،

"واشال اینہا در خطبۂ کتاب نورس کہ کہن سرائے جہان از دبدبۂ آوازہ است مرقوم گردیدہ"

(دیباچہ گلزار ابراہیم ظہوری)

"از ہر گرانہ[۱۲] کنایہ در میانہ و آتش طعنہ در زبانہ کہ ملک چون ظہوری مبنی بر خطبۂ کتاب نورس کہ فہرست ابیاتش شجرۂ اصالت نسب است ...... نثرے تمن نہ توانست نگاشت"

(ب) سہ نثر ظہوری کتاب نورس کے دیباچون کا مجموعہ نہین، یہ تین نثرون کا مجموعہ ہے، جو بلاشبہہ تین الگ الگ کتابون کے دیباچے ہین، جو کافی وقفہ[۱۳] کے بعد لکھے گئے ہین، پہلی نثر کتاب نورس کا دیباچہ ہے، دوسری گلزار ابراہیم اور تیسری خوان خلیل کا آخری دو کتابین ملک و ظہوری کی مشترکہ تصنیف ہین، جو صرف ان اشعار پر مشتمل ہین، جو ابراہیم عادل شاہ ثانی کی مدح مین تھے، راقم نے ان دونون کی اصل حیثیت کے بارے مین ایک تفصیلی مقالہ سپرد قلم کیا ہے،[۱۴] ڈاکٹر زور ہی اس غلط فہمی مین مبتلا نہین، بلکہ عبدالغنی صاحب اور رام بابو سکسینہ وغیرہ مصنفین بھی سہ نثر کو کتاب نورس کا دیباچہ قرار دیتے ہین،

---

[۱۲] دیباچہ نورس ظہوری و دیباچہ نورس ملک قمی (کلیات ملک ورق ۱۵۲ الف) [۱۳] پہلی نثر ۱۰۰۵ھ سنہ ۱۰۰۶ھ کے درمیان، دوسری ۱۰۰۹ھ سنہ ۱۰۱۲ھ کے درمیان اور تیسری ۱۰۱۳ھ سنہ ۱۰۱۴ھ مین لکھی گئی [۱۴] یہ مقالہ مارچ ۵۲ھ کے معارف مین شائع ہو چکا ہے،

(س) کتاب نورس کا بلاشبہ تعلق موسیقی سے ہے، مگر اس سے یہ قیاس نہ کرنا چاہئے کہ اس مین موسیقی کے اصول سے بحث کی گئی ہے، اور ابواب کی باقاعدہ تقسیم ہے، اس مین صرف ہندی کے راگ اور گیت ہین، جن کے ماتحت خود بادشاہ کے اشعار مختلف موضوع اور مختلف بحر اور ردیف و قافیہ کے ساتھ پائے جاتے ہین، شروع سے آخر تک کوئی ایک ہی مضمون نہین ہے، راگ کا بیان مقام کے ساتھ اور گیت کا بغیر اس لفظ کے ہوا ہے، ڈاکٹر زور کا قیاس ہے کہ سہ نثر مین کتاب نورس کے ابواب کی تفصیل درج ہے، یہ قیاس بالکل غلط ہے، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے سہ نثر کا بغور مطالعہ نہین کیا، ورنہ ایسی غلط فہمی نہ ہوتی، صرف سہ نثر کی پہلی نثر یعنی دیباچۂ نورس مین کتاب کی وجہ تسمیہ، اس کے ترجمہ اور دیباچہ کے بارے مین مختصر مگر مفید باتین درج ہین، دوسری نثر یعنی دیباچۂ گلزار ابراہیم مین بادشاہ کے فضائل کا بیان ہے، اس مین کتاب نورس کے متعلق کچھ نہین لکھا، تیسری نثر یعنی دیباچۂ خوانِ خلیل بادشاہ مذکور کی فضیلت کی مختصر داستان ہے، ساتھ ہی اس مین نورس محل اور نورسپور کا ضمنی تذکرہ ہے، آخر مین ارکانِ دولتِ عادل شاہی کا بیان ہے، جن مین شاہ نواز خان، ملک قمی، حیدر ذہنی، مولانا فرخ حسین، شاہ خلیل اللہ اور خود ظہوری شامل تھے،

مؤلف شہ پارے لکھتے ہین، (ص ۳۵)

"اس مین شک نہین کہ اس زمانہ مین (عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی مین) بہت سے اردو مصنفین موجود تھے، لیکن بدقسمتی سے ان کے متعلق بہت کم مواد موجود ہے، بہر حال راقم نے چار شاعرون کا پتہ چلایا ہو جنھون نے ابراہیم کے زمانہ مین عروج پایا، وہ چارون شاعر بالترتیب یہ ہین:-

آتشی، مقیمی، امین، نوری،

چونکہ دکھنی مین بہت قبل ہی سے تصنیف ہونے لگی تھی، اور کچھ شعرا بھی اس مین نظمیں کہتے تھے اس لئے ابراہیم عادل کے عہد مین اردو مصنفین کا وجود تسلیم کرنے مین کسی قسم کی قباحت نہین لیکن جن شعراء کا ذکر ڈاکٹر زور نے بیان کیا، اُن مین سے چند کا تعلق اس عہد سے نہ تھا، خصوصاً آتشی اور مقیمی کا، اس کے وجوہ حسب ذیل ہین،

۱- مؤلف شہ پارے کو ان دونون شاعرون کے حالات فتوحات کے ذریعہ ملے، اس کتاب کی تالیف کے وقت بقول ڈاکٹر موصوف آتشی بہت ہی نوجوان تھا، فتوحات کا سنہ تصنیف ۱۰۵۱ھ سے ۱۰۵۴ھ تک ہو، اگر ان سنون کے درمیانی سال مین بہت ہی نوجوان آتشی کی عمر ۲۵ سال مان لی جائے، پھر بھی ابراہیم عادل شاہ کی وفات کے وقت یعنی ۱۰۳۷ھ مین اس کی عمر کا ایک عشرہ بھی پورا نہ ہوگا، اس صورت مین اس کی شاعری کا عروج بادشاہ مذکور کے عہد مین کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟ اسی طرح مؤلف شہ پارے مقیمی کی نسبت لکھتے ہین کہ

"جس وقت قزوینی نے اپنی تاریخ ختم کی ہے، یہ تقریباً نوجوان تھا"

ظاہر ہے کہ ۱۰۵۴ھ مین جو شخص تقریباً نوجوان ہوگا وہ، ۱ سال قبل (یعنی وفات ابراہیم عادل کے وقت) تقریباً بچہ ہوگا، اس لحاظ سے وہ بھی ابراہیم کے عہد کا شاعر قرار نہین پا سکتا،

۲- بساتین السلاطین مین فضلائے محمد عادل مین حسب ذیل پانچ فضلا کے نام گنائے گئے ہین ابراہیم صنعتی، سید نور اللہ، حکیم آتشی، میرزا مقیم، میرزا دولت شاہ، اس سے صاف طور پر ڈاکٹر زور کے بیان کی تردید ہو جاتی ہے، ان فضلا مین سے ڈاکٹر موصوف نے دو کو ابراہیم عادل سے متعلق کیا ہو، اور نور اللہ، صنعتی، میرزا دولت کو محمد عادل شاہ سے منسلک بتایا ہے، مگر ان وجوہ و قرائن کو

---

۱ اردو شہ پارے ص ۳۶ ۲ فہرست مخطوطات فارسی دیوج ۱ ص ۳۱ (فتوحات ورق ۱۶ الف) ۳ اردو شہ پارے ص ۲۰ ۴ (قلمی) ورق ۱۵۳ اب بعد و مطبوعہ ص ۳۲۳ بعد

نظرانداز کیا گیا ہے، جن کی بنا پر ان پانچون شاعرون کو دو دربارون مین تقسیم کردیا ہے،

۳- ڈاکٹر زور کے ماخذ مین فتوحات کو خاص درجہ حاصل ہے، اگرچہ اس کے پانچوین باب مین تین ذیلی سرخیان ہین، پہلی کے ماتحت صرف ایک خطاط کا حال درج ہے، دوسری کے ذیل مین چار شاعرون کے حالات بیان ہوئے ہین، ان پانچون کا تعلق ابراہیم عادل سے تھا، مگر تیسری ذیلی سرخی مین دو شاعر یعنی آتشی و مقیم مذکور ہین، جن کا تعلق محمد عادل شاہ سے تھا، ذیل مین تینون ذیلی سرخیان درج کی جاتی ہین:

"ا- گفتار[50] اندر ہنرمندا ے کہ ہریک وحید زمان خود بودہ در عہد این بادشاہ عادل شاہ از جملہ خوش نویسان کہ در خدمت این بادشاہ می بودند اشارہ خلیل اللہ بت شکن است"

ب- بیان[51] حالات شعراے فرخ بیان و مداحان بلند قدر این دودمان عالی شان بیان احوال شاہ سواران میدان فصاحت و یکہ تازان عرصہ گاہ بلاغت، اشارہ بر روشن ضمیر این است کہ بناخن خیال در تار یکیہاے وجوہ گرہ وا بردے رموز غیبی کشودہ اند، گاہے در صورت نظم دگاہے در لباس نثر (اس کے ذیل مین ملک قمی، ظہوری، حیدر ذہنی اور مولانا باقر کے حالات درج ہین)

ج- ذکر[52] شعراے سخندان و مداحان این آستان،

"بلند فطرتانے کہ دقائق عالم لاہوتی را برشتہ خیال در آوردہ و مرسلہ اعجاز نامیدہ زیب گردن ناسوتیان ساختہ اند...... خصوصاً نادر طبعان، نادر کلامے کہ در جنب مداحان این دودمان والابیان اند، وبہ زبان خجستہ بیان ذکر محامد خسرو آفاق دشہریار باستحقاق می نمایند

[50] فتوحات ص ۳۷۰، [51] ایضاً ص ۳۶۸

[52] فتوحات ص ۳۷۰،

اس کے ماتحت آتشی اور میرزا محمد مقیم مذکور ہوئے ہین، آتشی کا ذکر یون شروع ہوتا ہے:-

"سرحلقۂ بادہ[53] نوشان بزم خیال، رموز آموختہ خلوت حال و مقال حکیم دانش پژدہ زیب محفل فرہنگی و دانشی سید نیکو سیر حکیم آتشی..... الحال کہ در اوائل جوانی اند"

میرزا مقیم کا حال اس طرح بیان کرتا ہے،

"دیگر از مداحان[54] این دودمان دولت نشان میرزا محمد مقیم است، از فوت پدر پریشان حال گردیدہ شدہ اید سفر را بر لذات وطن گزیدہ عازم سفر ہندوستان گردیدہ، الحال بر درگاہ بادشاہ کسری جاہ از معروفان است واکثر بہ الطاف خسروی سرافراز می گردد"

ان مین (ا) (ب) کا تعلق عہد ابراہیمی سے ہے، اور (ج) کا محمد عادل شاہی سے، اس کے وجوہ حسب ذیل ہین،

۱- آتشی اور مقیم کا ذکر صیغۂ حال مین ہوا ہے، فرید مقیم کو درگاہ بادشاہ کسری جاہ مین بتاتا ہے، بادشاہ کسری جاہ سے مراد محمد عادل شاہ ہے، جس سے مؤلف فتوحات خود منسلک تھا،

۲- مقیم کا ایک قصیدہ[55] فتوحات مین منقول ہے، جس کا عنوان یہ ہے:-

"در صفت قطب زمانہ سید گیسو دراز قرین بہ اسم بادشاہ زمن"

قصیدہ کا مطلع مع چند درمیانی شعر کے درج ذیل ہے،

اے فضاے درگہت جولانگہ عرش برین ۔۔۔ خشت فرش آستانت آسمان ہفتمین

سید و مخدوم عالم شمع بزم کائنات ۔۔۔ بادشاہ دین و دنیا قطب بزرگ جان آتشین

[53] فتوحات ص ۳۷۰، [54] ایضاً ص ۳۷۳ و ۳۷۲، [55] مقیم کے دو قصیدے درج ہین، متن مین دوسرے قصیدے سے سروکار ہے جو ص ۳۷۶ تا ۳۷۹ پر ہے،

بگذراند گہ گہے سید محمد بر زبان   صاحبِ عالم لدنی گرد داز روی یقین
بلبلِ گلزار عرفان ہادی راہ نجات   مفتیِ بزمِ طریقت قاضیِ شرعِ مبین
بادشاہ صورت و معنیٰ محمد شاہ زد   بوسہ بر خاکِ جنابش از رہِ صدق و یقین
شد مریدے از مریدانِ شہِ گیسو دراز   شاہ غازی سایۂ خورشید رب العالمین

ان اشعار سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ

ا۔ یہ محمد عادل شاہ کے نام پر لکھے گئے ہین، شاہ غازی اسی کا لقب تھا،

ب۔ بادشاہ شاہ گیسو دراز کے مزار پر حاضر ہوا تھا، اور اسی موقع پر یہ قصیدہ لکھا گیا،

ج۔ بادشاہ اسی خاندان سے مرید بھی ہوا،

ملا ظہور نے محمد نامہ مین لکھا ہے کہ ۱۰۴۴ھ مین محمد عادل شاہ نے مزار شریف پر حاضری دی تھی، اور عرس مذکور مین بادشاہ کے ساتھ ملا ظہور بھی تھا، اس نے بھی ایک قصیدہ لکھا تھا،

"در عرس[۲] مذکور راقم این نامۂ محمدی ہنگامہ قصیدہ غرائے مشتمل بر تعریف و توصیف روضۂ اقدس و ستائش حضرت بادشاہ غازی در سلک نظم کشیدہ بحضور اشرف گذرانید، و بہ عنایت خسروانہ مفتخر گردیدہ"

تفصیل بعینہٖ مقیم کے قصیدہ پر پوری اترتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقیم بھی حاضر آستانہ ہوا تھا،

[۱] گیسو دراز کے خاندان سے نہ صرف عقیدت مندی ہی تھی، بلکہ محمد عادل شاہ کی ایک بہن، فاطمہ سلطانہ المعروف بہ بادشاہ صاحبہ کی نسبت شاہ حبیب اللہ بن شاہ ید اللہ سے جو شہ گیسو دراز کی اولاد مین سے تھے، ۱۰۵۱ھ ہجری مین ہوئی تھی، ابراہیم عادل شاہ کے اس عمل سے صاف ظاہر ہے کہ اس کو اس خاندان سے بے حد عقیدت تھی، (دیکھو بساتین ص ۲۵۸، ۲۵۹)

[۲] محمد نامہ (قلمی) صفحہ ۱۵۱،

یہ بھی جاننا چاہیے کہ ظہور کا بھی قصیدہ اسی زمین مین ہے، جس کے چند شعر درج ذیل ہین، اس سے یہ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ مقیم کی نظم اسی خاص موقع پر لکھی گئی، اور بحر اور ردیف و قافیہ کی پابندی یا تو بہ اشارۂ شاہی عمل مین آئی ہو گی، یا شعرائے وقت کے مقابلہ کے جذبہ سے یہ صورت رونما ہوئی ہو گی، ممکن ہے دوسرے شعراء کی بھی نظمین ہون لیکن وہ ہماری دسترس سے باہر ہین،

روضۂ مخدوم عالم قبلۂ دنیا و دین   عالم آرا گشتہ ہمچو لطفِ رب العالمین
گنبدِ والاے او تا گشت زیبِ کائنات   شد دل پیدا برائے سینۂ چرخِ برین
قبۂ خورشید کاخش چون شدہ عالم فروز   آشکارا گشت رازِ اولین و آخرین
بر درِ این روضۂ عالی "علیٰ" با بہا   آیتِ فتح است در شانِ شہِ نصرت قرین
خرم آن ساعت کہ موے حضرتِ گیسو دراز   از برائے فتحِ بابِ کشور و دنیا و دین
طالعِ شہ بین مریدِ حضرتِ مخدوم گشت   شاہ صاحب طالعِ گیتی ستان باید چنین

ظہور نے محمد نامہ مین ایک اور جگہ لکھا ہے کہ ۱۰۵۰ھ[۱] ہجری مین پھر بادشاہ غازی گلبرگہ شریف گیا، اور وہان کے عرس مین شریک ہوا، اس موقع پر ظہور پھر ساتھ تھا، اور روضہ کی مدح اور بادشاہ کی ستائش مین مدحیہ کلام[۲] پیش کیا، لیکن مقیم کا متذکرۂ بالا مقصد بادشاہ کی اس زیارت سے متعلق نہین کیونکہ وہ فتوحات مین منقول ہے، جو اس سنہ سے ۳-۴ سال قبل ہی مکمل ہو چکی تھی،

اس تفصیل سے صاف ظاہر ہے کہ مقیم کا تعلق محمد عادل شاہ سے تھا، ایسا بھی نہین ہے کہ

[۱] محمد نامہ (خطی) ص ۳۵۰-۳۵۱ یہان تاریخ ۱۰۳۶ھ درج ہے، مگر سر جادو ناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ تاریخ ۱۰۵۶ھ ہونا چاہیے، ڈاکٹر ہیو نے فتوحات عادل شاہی کے حوالے سے لکھا ہے کہ محمد شاہ عادل نے ۱۰۵۴ھ مین سید گیسو دراز کے مزار پر حاضری دی (برٹش میوزیم کیٹلاگ ص ۳۱) [۲] ایضاً صفحہ ۳۵۵، اس موقع پر ترجیع بند لکھا تھا جس کے پہلے بند کے چند شعر آخر مقالہ مین درج ہین،

ڈاکٹر زور کا مقیمی، مقیم سے الگ ہوا کیونکہ انھون نے فزونی ہی کے مقیم کو اپنا موضوع بنایا ہے،

۳۔ جب فزونی نے ابراہیم عادل شاہ کے شعراء کے حالات ایک سُرخی مین بیان کر دیئے، تو پھر اُسی باب مین اُس عہد کے شعراء کی ایک دوسری ذیلی سُرخی قائم کرنا بے کار تھا، اس عبارت سے بھی آتشی اور مقیم ابراہیم عادل کے عہد کے شاعر قرار نہین پا سکتے،

فزونی کی اس عبارت کے فریب خوردہ صرف ڈاکٹر زور ہی نہین ہین، بلکہ پروفیسر یاسو بھی ان کی طرح آتشی اور مقیم کو ابراہیم عادل شاہ کے درباری شعراء مین شمار کرتے ہین، چنانچہ اپنے مقالہ بعنوان "شعرائے عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی"[۱] مین انھون نے ان دونون کو ملک قمی، ظہوری، حیدر ذہنی، باقر، اور خلیل اللہ کی صف مین کھڑا کیا ہے، ان کو بھی غلط فہمی صرف اسی بنا پر ہوئی کہ وہ متذکرۂ بالا دوسری اور تیسری ذیلی سرخیون مین فرق نہ کر سکے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونون سرخیون کے ذیل کے شعراء ایک ہی ساتھ شامل کر دیئے گئے، اسی طرح ڈاکٹر ریو نے برٹش میوزیم کے کیٹلاگ[۲] مین فتوحات عادل شاہی باب پنجم کو ابراہیم عادل شاہ کے شعراء پر مشتمل بتایا ہے، حالانکہ جیسا بیان ہو چکا ہے اسی باب مین وہ دونون شاعر بھی شامل ہین، جن کا تعلق محمد عادل شاہ سے تھا، (باقی)

---

[۱] انڈین ہسٹاریکل کمیشن ریکارڈس (جرنل) ۱۹۳۹ء جلد ۱۶ ص ۱۵۸ تا ۱۶۳ [۲] فہرست مخطوطات فارسی درموزۂ برطانیہ (ریو) ج ۱ ص ۳۱۷،

اُسوۂ صحابہ جلد اوّل

دِلّی اور لکھنؤ کی زبان

از

جناب شوکت سبزواری ایم اے لکچرار اردو ڈھاکہ یونیورسٹی

گذشتہ دسمبر کے "معارف" مین میرا ایک مختصر سا مقالہ "لکھنؤ کی زبان" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، عام طور سے لوگ سمجھتے ہین کہ لکھنؤ کی زبان بنیادی طور پر دلّی کی زبان سے مختلف ہے، اور لکھنؤ کو دلّی سے الگ جو مستقل اور آزاد ادبی دبستان کی حیثیت حاصل ہے، وہ زبان کے اس اختلاف کی وجہ سے ہے، مین نے اس مقالہ مین اس عام خیال کا رد کیا تھا، اور بتایا تھا کہ دلّی اور لکھنؤ کی زبان مین کوئی فرق نہین، ان دونون تہذیبی مرکزون کی زبان بنیادی طور پر ایک ہے، اس سلسلہ مین اُن صرفی ونحوی اصول کا ذکر بھی آگیا تھا، جنھین لوگ "لکھنوی زبان" کی خصوصیت بتاتے ہین، اور جو دلّی اور لکھنؤ مین بولی جانے والی زبانون کا مابہ الامتیاز ہین، زبان کی وحدت پر زور دینے کے لئے مین نے ان اصول کی لسانی تاریخ بھی دیدی تھی، بحث خالص علمی اور لسانی تھی، مین جو صحیح سمجھتا تھا بغیر کسی جھجھک کے لکھ گیا تھا، اس مین دلّی دوستی، اور لکھنؤ دشمنی کا کوئی شائبہ نہ تھا، مجھے کیا معلوم تھا کہ اگلے وقتون کے لوگ اُس پر بگڑ جائین گے، اور میری تحقیق اور ٹھوس علمی بنیادون پر استوار تحریر کو لکھنوی زبان کی تحقیر اور ساکنانِ لکھنؤ کی تنقیص تصور فرمائین گے،

خیر ہے میرے بزرگ اور دیرینہ کرم فرما نواب جعفر علی خان اثر لکھنؤ کے فدائیون مین سے ہین، وہ

اس تحریر پر بہت برہم ہوئے، اور اپنی بزرگی اور پیرانہ سالی کا خیال تک نہ کیا، لکھنؤ کی حمایت مین خم ٹھونک کر میدان مین آگئے، لیکن مجبور تھے کرتے کیا، تحقیق کا میدان اور خالص علمی اور لسانیاتی بحث، دخل دین تو کیونکر، اور کہین تو کیا، بآخر لکھنؤ والون کی طرح چلتے فقرون سے کام چلایا، مجھے بُرا بھلا کہہ کر دل کی بھڑاس نکالی، "دلی کے نادان دوست" کی پھبتی کہی، تماشبینی انصاف اور تعلّی کا طعنہ دیا، اور جب اس سے بھی دل ٹھنڈا نہ ہوا، تو ڈانٹ بتائی کہ اگر مین یہ کہون اور وہ کہون" تو پروفیسر صاحب کو بغلین جھانکنے کے واسطے (واسطے کی ایک ہی کہی) نہ بن پڑے" اور اگر یہ اور اضافہ کردون تو پروفیسر صاحب پر راہ فرار بھی مسدود ہو جائے" خدا نے بڑی خیر کی کہ نواب صاحب صرف ڈانٹ بتا کر رہ گئے، ورنہ مجھے بغلین جھانکتے نہ بن پڑتی، اور راہ فرار مسدود ہو جاتی، تو بڑا غضب ہوتا، نواب صاحب کا ٹکر ٹکر منھ تکتا اور دم نہ مارتا،

نواب صاحب کی ساری تحریر اعجوبہ ہے، اس مین سب کچھ ہے، غم و غصہ کی لہرین ہین، غلط فہمیون کی تہین ہین، معصومانہ اعتراف شکست ہے، زبان کے مسلّمون سے افسوسناک بے خبری ہر داؤن پیچ اور پیترے ہین، پُر کارانہ سادگی ہے، ان مین سے غم و غصے کی لہر تو آپ نے دیکھ لی کہ ایک خالص علمی اور لسانی بحث مین نواب صاحب کیسے آپے سے باہر ہوئے ہین، اور شاید یہ اسی کا اثر ہے کہ نواب صاحب جو لکھنؤ کے مستند زبان دان ہین کچھ ایسے سٹ پٹائے کہ بیچاری اردو کی ٹانگ توڑ کر رکھدی ہین اُن کے اسی مضمون سے زبان و بیان کی نوابی شان دکھاتا ہون، سب سے پہلے تو وہی اوپر والا جملہ لیجئے :-

"پروفیسر صاحب کو بغلین جھانکنے کے واسطے نہ بن پڑے"

ہم اسے یون کہتے ہین "بغلین جھانکتے نہ بن پڑے، یا بغلین جھانکنے کے سوا کچھ نہ بن پڑے" ایک مقام پر ارشاد ہوا ہے :-

"دہلی کے خاندان امنڈ کر لکھنؤ مین آباد ہو گئے"

کیا یہی وہ ادائین ہین جو لکھنؤ نے اردو کو سکھائین، اگر یہ ادائین ہین تو شتر غمزے کیا ہین، دہلی کے خاندان امنڈ کر لکھنؤ مین آباد ہو گئے، یعنی چہ؟ کہین یہ مقصد تو نہیں کہ دہلی کے خاندان امنڈ کر لکھنؤ چلے آئے، اور یہان بس گئے، کہنا یہ چاہتے تھے کہ پروفیسر صاحب اردو کو اودھی سے متاثر بتاتے ہین، اور لکھ یہ گئے،

"پروفیسر صاحب اردو کو اودھی سے متاثر کرتے ہین"

اسلوب بیان کے ڈھیلے پن کی شاید اس سے بڑھ کر مثال پیش نہ کی جا سکے، پھر لکھنؤ کی اردو کو اودھی کا پروردہ ثابت کرنے کو فرماتے ہین "یہ کو کو گیا؟" یون کہتے تو کیا بُرا تھا "لکھنؤی اردو اودھی کی پروردہ ہے" اسے اس طرح ثابت کرتے ہین یہ تو "مطرود اسلوب نگارش" ہوا، زبان کی تراش خراش بھی ملاحظہ فرمائین :-

"اس مغربی ہندی مین پنجابی بھی سمو گئی ہے"

یہان سمونا اثر صاحب نے اردو محاورے اور روز مرہ کے خلاف لازم استعمال کیا ہے، یہ متعدی ہے، اس کے اصلی معنی ہین سرد پانی مین گرم پانی ملانا، مطلقاً ملانے اور آمیزش کرنے کو بھی سمونا کہتے ہین، سمو گیا اور سمو دیا، دونون طرح صحیح ہے، لیکن دونون صورتون مین متعدی ہی کے معنی کہتے ہین

ع یان اشک گرم نے مرے دریا سمو دیا

میر درد فرماتے ہین :-

مین گرچہ گرم و سرد زمانہ سمو گیا

مضمون کے آغاز مین "پچھلا" ایک لفظ استعمال ہوا ہے، یہ "دم چھلا" ہونا چاہیئے یا "پن چھلا" "پچھلا" اردو مین پہلے کی ضد ہے، اگر اثر صاحب نے اس کے معنی تابع لئے ہین، تو یہ ان کی اپج ہے، دد

محاورے، انھون نے غلط استعمال کئے ہین، "آنکھون مین دھول جھونکنا" غلط، "خاک جھونکنا" صحیح، کس برستے پر تتا پانی" اہل زبان نہین بولتے، "اس بہتے پر تتا پانی" کہتے ہین، اثر صاحب نے عامیانہ" عوامی مین فرق نہین کیا، "رئیسانہ ٹھاٹ باٹ" پر اعتراض فرماتے ہین، کہ

"یہ عامیانہ زبان ہے اور بقول ایک دوسرے دہلوی پروفیسر کے دلی والون نے زبان سیکھی ہی عوام سے ہے"

(عوام سے سیکھی گئی ہے، اس لئے عامیانہ ہے) نواب صاحب کو عوام سے اتنی نفرت ہے، تو وہ عوام کی زبان کیون بولتے ہین، عوام کے ہان عامی عام کی طرف منسوب اور عوامی کا مترادف ہے، خواص اور اہل علم کی زبان مین عامی عارف کی ضد ہے، اور جاہل کے معنی مین ہے، اور عمی (اندھا پن اور جہالت) سے اسم فاعل ہے،

اب ذرا غلط فہمیان ملاحظہ فرمائین، فہرست طویل ہے، مین مثلاً ایک دو کا ذکر کرون گا، مین نے تحریک اصلاح زبان پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ولی کا کلام محمد شاہ کے عہد مین دلی پہنچا، تو دلی والون کے دل مین شوق پیدا ہوا کہ وہ اس زبان مین شعر کہین، دکنی زبان شاہجہان آباد کے محاورے اور روزمرہ کے خلاف تھی، شروع شروع مین تو حاتم اور ان کے رفقا، آرزو و فغان وغیرہم نے ولی کا تتبع کیا، اور اسی کی زبان و طرز بیان مین شعر کہے لیکن بعد مین خاص طور سے حاتم کو اس کا احساس ہوا کہ وہ جو زبان استعمال کر رہے ہین، شاہجہان آباد کے محاورے کے خلاف ہے، اس کے بعد انھون نے اپنی روش بدلی، اور دکنی الفاظ، محاورے اور مخصوص استعمالات ترک کرنے شروع کئے، اصلاح زبان کی تحریک کا آغاز یون ہوا، اردو ادب کی تاریخ کا یہ ایک مشہور واقعہ ہے، جسے بچہ بچہ جانتا ہے، مشہور تذکرہ نگار گیال کا بیان ہے، اور اس کا اعتراف دتی تاسی کو بھی ہے کہ دکن کی زبان کا اثر شمالی ہند کے شعرا، پر ولی کے زمانے سے بہت پہلے شروع ہو گیا تھا،

چنانچہ اس نے لکھا :-

"محمد فضل (جھنجھانوی) نے اپنی مشہور نظم بکٹ کہانی دکن کی اردو مین لکھی، اس لئے کہ اس وقت اس کے سامنے شاعری کا کوئی نمونہ نہ تھا، اور ریختہ مقبول نہین ہوا تھا"

اسی فاضل نے حاتم کے بارے مین لکھا ہے

"ولی کا دیوان دہلی پہنچنے کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے اس زبان مین لکھنا چاہئے، اور دوسرے شاعرون نے اس کی تقلید کی" (بحوالہ اردو جلد سوم ص ۵۱۷)

زور لکھتے ہین کہ

"اس کی (حاتم) زبان اور ترکیبین واضح کرتی ہین کہ دہلی مین اردو شاعری کی ابتدا اول اول ولی کے کلام کی ہوبہو تقلید مین کی گئی تھی" (ہندوستانی ۱۹۳۲ء ص ۴۲)

تذکرۂ بے جگر مین ہے، جس کا مخطوطہ انڈیا آفس مین ہے :-

"چون در سنہ اثنا جلوس محمد شاہی دیوان او (ولی) بدہلی رسید موزون طبعان بلند فکر و عالی تلاشان ہم عصرش مثل حاتم و آبرو و فغان وغیرہ بہ تتبع زبانش ہم زبان شدند"

یہ چند حوالے ہین، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ولی کا تتبع کرنے والون نے صرف شعر کی روش اور اسلوب ہی مین اس کی تقلید نہین کی، بلکہ انھون نے زبان بھی وہی اختیار کی، جو ولی کی تھی، اب اصلاحی تحریک کے امام حاتم کی زبانی سنئے کہ انھون نے اس زبان کی جو ولی کے اثر سے دہلی مین پھیل گئی تھی، کیا اور کیسے اصلاح کی، فرماتے ہین

"دس بارہ سال سے مین نے ان الفاظ کو (دکنی الفاظ) ترک کر دیا ہے اور عربی و فارسی الفاظ جو کثیر الاستعمال ہین، اور دہلی کا روزمرہ جسے "میرزایان ہند اور فصیح گویان رند"

سبھی سمجھتے ہین اختیار کر لیا ہے ۔۔۔۔ صرف روز مرہ جو عام فہم بھی ہے ، اور خاص پسند بھی ؛

(دیباچہ دیوان زادہ بحوالہ اسیر لکھنؤ اردو ھ گلبانگ ص ۱۹)

کتنی بڑی غلط فہمی ہے کہ ہمارے نواب صاحب جو خیر سے سخندان ہونے کے ساتھ ساتھ سخن شناس بھی ہین سمجھے ، اس ساری بحث کا مطلب یہ کہ زبان کی اصلاح کرنے والون نے دلی کے کلام کو اصلاح سے مزین کیا ، اردو مین اصلاح زبان کی تحریک کا آغاز حاتم و مظہر سے ہوا ، اور اختتام ناسخ پر ، کیا آثر صاحب تحریک کے اس پورے سلسلہ سے ناواقف ہین ، کیا انھون نے لکھنوی ہونے کے باوجود ناسخ کی لسانی اصلاحون پر فخر نہین کیا ؟ مین نے اس تحریک کا پس منظر دکھا کر بتایا تھا کہ اس کی ضرورت کیون پیش آئی ، کس لئے چند الفاظ اور محاورے ان مصلحین نے متروک قرار دیئے ، اگر وہ ہماری زبان کے تھے ، اور عام طور سے بول چال میں آتے تھے ، اس کے جواز کے لسانی اسباب کیا ہین ، اصلاح کسی فساد کی ہوئی ہے ، یہ فساد اردو مین کہان سے آیا ، اور کیسے آیا ؛ مین نے عرض کیا تھا کہ یہ دکنی اردو کے اثر سے پیدا ہوا ، دلی کے ساتھ یا اس سے پہلے دکن کی نامانوس زبان دہلی پہنچی ، دہلی والون نے شعر گوئی کے شوق میں اس کی تقلید کی ، اور یہ بگاڑ ان کی زبان مین راہ پا گیا ، اس لئے مظہر ، میرزا اور ناسخ نے زبان کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ، عوام تو پہلے ہی ان الفاظ و محاورات سے آشنا تھے ، خواص نے البتہ دکنی شعراء کی تقلید مین اس خس و خاشاک کو لگا رکھا تھا ، وہ بھی ترک کرنے لگے ، اور اردو زبان عوام کی روزانہ بول چال کے مطابق ڈھلنے لگی ، قائم کا یہ شعر تو آثر صاحب کو یاد ہی ہوگا ،

قائم مین غزل طور کیا ریختہ ورنہ ۔۔۔ اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

آثر صاحب بتائین کہ قائم نے دلی کے کلام کو "غزل طور" کیا تھا ، یا ریختہ کو !!

اس سے بھی بڑی غلط فہمی کا شکار "ہمارے لکھنوی" دانا دوست" اس مقام پر ہوئے جہان مین نے لکھنو کی زبان پر اودھی اثرات دکھائے ہین ، اور اس کے اسباب بتائے ہین ، مین نے لکھا تھا کہ لکھنو اور اس کے آس پاس کا علاقہ اودھی اور اس کے حلقے کی دوسری بولیون کا علاقہ ہے ، یہان کے عوام کی زبان اردو نہ تھی ، یہ پوربی بولتے تھے ، (اور آج بھی بولتے ہین) گھرون اور گلیارون مین آج تک یہ چلتا تھا ، آثر صاحب ان مین سے کسی چیز کا بھی انکار نہ کر سکے ، آخر وہ اس حقیقت کو کیسے جھٹلاتے ، اس کے بعد یہ جملہ تھا ،

"دربار مین اردو بولنے والون کے گھر بار کی زبان پوربیا تھی"

اس پر ان کا اعتراض ہے ، فرماتے ہین ،

"کس قدر مضحک ہے ، یہ ادعا (اجی حضرت دعوی کہئے ، شوکت) کہ وہی لوگ جو دربار مین فصیح اردو بولتے تھے ، گھر پہنچتے پہنچتے گنوار ہو جاتے تھے ،

بات صاف اور سلجھی ہوئی تھی ، اردو اُن چند اونچے گھرانون کی زبان تھی ، جو بقول حضرت آثر امنڈ کر لکھنو مین آباد ہو گئے تھے ، لکھنو مین صرف یہ چند گھرانے ہی تو نہ تھے ، پورا شہر آباد تھا ، وہان کے اصلی باشندے بھی تھے ، اور یہ بڑی تعداد مین تھے ، یہ لوگ کہان بستے تھے ، اور کون سی زبان بولتے تھے ، نوابون کی ڈیوڑھیون پر ملازم کون تھے ، کیا وہ بھی نواب ابن نواب تھے ، مامائین ، خواصین ، اصلین کہان سے درآمد کی جاتی تھین ، مہریان اور کہاریان کہان سے آتی تھین ، یہ سب لکھنو کی نہین تھین تو کہان کی تھین ، کیا اُن اونچے گھرانون کے افراد نے اودھ مین شادیان نہین کین ، کیا اُن کے حرم سراؤن مین لکھنو والیان نہین تھین ، اُن کے ساتھ دربار مین اردو بولنے والے ظاہر ہے ، فصیح اردو مین بات نہ کر سکتے ہون گے ، اور نادانستہ پوربی زبان کے بہت سے الفاظ اور محاورے ، ہمارے فصحاء کی زبان پر چڑھ گئے ہون گے ، آج یہ الفاظ اور محاورے لکھنوی اردو کا جزو بنے ہوئے ہین ،

یہ بھی نواب صاحب نے خواب کہا ہے ۔

دلی
"لکھنؤ جانے والوں کا وطن تو لکھنؤ ہوگیا، مگر جس زبان کو وہ ہمراہ لائے تھے، وہ اجنبی رہی، اور لکھنؤ اس کا وطن نہ ہو سکا"،

کس کم بخت نے کہا کہ اردو لکھنؤ کی نہ ہوئی ہوئی/دیسی ہوئی کہ اس پر لکھنؤ کی آب وہوا، تہذیب وتمدن، بول چال، مزاج ومنہاج رنگ وآہنگ ہر چیز کی ایک گہری چھاپ لگ گئی، ہم اس چھاپ کو دھونا چاہتے ہیں، اور اس میں اگلی سی سادگی اور لوچ پیدا کرنا چاہتے ہیں، برا ہو ان لوگوں کا جو یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ خود دلی کے ہیں، ان کی زبان دلی کی ہے، اُن کے آبا واجداد دلی کے ہیں، میر انیس برسوں لکھنؤ میں رہے، مگر اپنی زبان کو غیر صالح آمیزش سے پاک رکھا، ان کے گھر کی اردو حضرات لکھنؤ کی اردو سے الگ تھلگ رہی، اپنی اصلیت بھولنے والوں کو میں کیا کہوں،

اور ہاں یہ کیا کہا کہ گھر پہنچتے پہنچتے گنوار ہو جاتے تھے، کیا یہ ناممکن بات ہے، میں روزانہ اپنے بعض ساتھیوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ یونیورسٹی سے گھر پہنچتے ہی آوت جاوت کس شروع کردیتے ہیں، اور اثر صاحب کے لفظوں میں گنوار بن جاتے ہیں، یہ بھی اپنے کو لکھنوی بتاتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں کہ وہ اہل زبان ہیں، جو بات روزانہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں اثر صاحب کی خاطر اسے کیسے جھٹلاؤں؛

چند مثالیں اعتراف شکست کی یہ میں نے عرض کیا تھا کہ اہل لکھنؤ عربی مونث الفاظ کو جمع کی صورت میں مذکر بولتے اور لکھتے ہیں، اثر صاحب فرماتے ہیں یہ لکھنؤ والوں کی اُپج ہے، اور یہ اپج میرے ہوش کی بات ہے، چلئے بات ختم ہوئی؛ نواب صاحب کے ہوش کی بات تھی، انہی انھوں نے اس کا اعتراف کرلیا، کچھ ایسی اپج بھی ہیں، جو غالباً نواب صاحب کے ہوش سے پہلے کی ہیں، اس لئے انھیں اس کا ہوش نہیں، نواب صاحب فرماتے ہیں میں ان لوگوں میں ہوں جو اس

قاعدے کی سختی سے پابندی نہیں کرتے،" بڑی مسرت کی بات ہے کیا اچھا ہو کہ وہ لکھنوی زبان کی دوسری بدعتوں سے بھی اسی طرح بیزار ہو جائیں تاکہ اردو کے اصلی مرکز دلی سے الگ لکھنؤ میں ڈیڑھ اینٹ کی جو مسجد ضرار بنالی گئی ہے، وہ اردو کی وحدت لسانی کو ضرر نہ پہنچائے، ایک دوسرا اعتراف نواب صاحب نے بڑی وسعت قلب کے ساتھ فرمایا ہے، کہتے ہیں یہ ہزار بار صحیح کہ "نا" علامت مصدر کو فاعل کا تابع ہونا چاہئے، (اثر صاحب فاعل اور مفعول میں فرق نہیں کرتے "نا" علامت مصدر متعدی افعال میں مفعول کے مطابق ہوتی ہے، اور یہ نزاع متعدی افعال میں ہے) مذکر ہے، تو "نا" اور مونث ہے تو "نی" لکھنؤ والے دونوں صورتوں میں "نا" لاتے ہیں، مصدر میں تذکیر و تانیث کے قائل نہیں، یہ بھی جلال لکھنوی اور ان کے بعض معاصرین کی اپج ہے"،

چلئے دو بڑے فرق مٹے، اہل دلی ہمیشہ عربی زبان کے ان مونث الفاظ کو جن کی جمع "ات" کے اضافے سے بنتی ہے، جمع کی صورت میں مونث لکھتے ہیں، آپ بھی مونث لکھئے، دوسرے "نا" (علامت استقبال) میں جنس کا فرق کرتے ہیں، مونث کی صورت میں مونث اور مذکر کی صورت میں مذکر، آپ بھی اُس کی پابندی کیجئے، اور سختی کے ساتھ اس پر عمل کیجئے، لیکن مجھے اثر صاحب کے قول پر اعتماد نہیں وہ دب کر اور بحث میں زچ ہو کر اکثر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں، لیکن اس پر عمل نہیں کرتے، اپریل ۱۹۳۲ء کے "ہندوستانی" میں جلیل قدوائی کے مجموعۂ کلام "نقش و نگار" پر انھوں نے تبصرہ کیا تھا، یہ اس وقت میرے سامنے ہے، اس میں "نا" (علامت مصدر و استقبال) فاعل (بقول اثر) کے خلاف مذکر اور مفرد ہے ملاحظہ ہو،

"معائب و محاسن دونوں دکھانا (دکھانے) چاہئے (چاہئیں) (ص ۲، ۲ سطر ۱۰) فہرست پیش کرنا مقصود نہیں" (ص ۵، ۲ سطر ۱) "دہی محبت ٹپکتی ہے، جو ایک استاد کو اپنے شاگرد سے ہونا چاہئے" "ذیل کے جملے میں خصوصیات کو مذکر لکھا ہے اور "نی" کی جگہ "نا" ہے،

"اس مقدمے کے بعد جلیل کے خصوصیات کلام سے بحث کرنا تحصیل حاصل ہے۔"

(ص ۲۷۵ سطر ۱۸)

اثر صاحب نے رسالہ شاعر اکتوبر ۱۹۵۱ء میں صاف صاف اقرار کیا تھا کہ صرف ایک جملے میں جو عوام بولتے ہیں، "برسیں ہو گئیں"، "برسیں" آیا ہے، "معارف" میں اس سے بھی بگڑ گئے، فرماتے ہیں

"میں نے کسی ثقہ کو (یعنی نواب کو شوکت) برسیں بصیغہ جمع بولتے نہیں سنا"

زبان بھی کوئی روایتِ حدیث ہے کہ بولنے والا ثقہ ہو تو مانو ورنہ انکار کر دو، یہاں تو عوام ہی سب کچھ ہیں، انہی کے دربار سے لفظوں کو چلن ملتا ہے، اور بقول ایک ماہر لسانیات کے "زبان کے معاملے میں چلن بڑی سند ہے، یہی ایک معیار یا کسوٹی ہے جس سے کسی لفظ کے ٹکسالی ہونے کا پتا چلتا ہے، اس کی صحت اور فصاحت پہچانی جاتی ہے" اس سلسلے میں اثر صاحب سے ایک لطیفہ ہوا ہے، فرماتے ہیں:۔

"برسیں برس کی جمع نہیں، بلکہ برسوں کی تانیث ہے" (شاعر اکتوبر ۱۹۵۱ء)

ٹھیک بالکل ٹھیک "عورتیں" بھی تو عورت کی جمع نہیں، عورتوں کی تانیث ہے، زبان کے یہ نکات لطائف اور معارف بیچارے "دلی والے پروفیسر" کیا جانیں، "عامی" جو ہوئے،

ایک نکتہ سن رکھیں "نا" اردو میں دو ہیں، ایک علامت مصدر دوسرے علامت استقبال مثلاً "بات کرنا دشوار ہو گیا، روٹی کھانا مشکل ہے، نماز پڑھنا آسان ہے، ان میں "نا" مصدری ہے، "مجھے تعزیر دینی ہے، کلیاں بھیجنی ہیں، ان میں "نا" (جو "نی" ہو گیا ہے) استقبالی ہے، یہی "نا" فارسی "کردنی" اور سنسکرت "کرنیم" میں ہے، یہ استقبالی "نا" تذکیر و تانیث کی حالت میں بدلتا تھا، اس کی دیکھا دیکھی فصحائے دہلی و لکھنؤ نے "نا" مصدری کو بھی حالتِ مونث میں بدلنا شروع کر دیا، اور "بات کرنا" کو "بات کرنی" اور "روٹی کھانا" کو "روٹی کھانی" کہنا شروع کر دیا، جلال مرحوم نے اس کے خلاف

آواز اٹھائی، اور یہ تجویز پیش کی کہ "نا" مصدری کو ("نا" استقبالی کو نہیں) نہ بدلا جائے، اور مذکر و مونث دونوں حالتوں میں "نا" رکھا جائے، اس تجویز کا یہ اثر ہوا کہ متاخرین اہلِ لکھنؤ نے (حضرت اثر اور ان کے نقاد انہی میں ہیں) "نا" استقبالی کو بھی غیر متصرف بنا لیا، اور مونث کی حالت میں بھی "نا" لکھنے لگے، یہ ان کی غلطی تھی، اور شاید برائے شگون یعنی دلی والوں کی مخالفت میں امیر مینائی کا شعر ہے،

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی — بھیجنا ہیں ایک کمسن کے لئے،

یہاں "بھیجنی" ہونا چاہئے، "نا" مصدری نہیں استقبالی ہے، حضرت اثر کا یہ جملہ میں اوپر لکھ آیا ہوں، "وہ محبت جو ایک استاد کو اپنے شاگرد سے ہونا چاہئے" یہ "نا" بھی استقبالی ہے

تیسری بحث یعنی زبان کے مسئلوں سے بے خبری بڑی اہم ہے، ایک ادیب اور نقاد کے لئے ان مسئلوں کا جاننا ضروری ہے، ان کے جاننے ہی سے ایک عامی اور عالم میں فرق ہوتا ہے، جو ان سے بے خبر ہے، وہ عالم نہیں "عامی" ہے، اس کی زبان "عامیانہ" ہے، اس کے فیصلے ناقابلِ اعتبار ہیں، اس کا ذوق صحت و فصاحت کے فرق و تمیز سے محروم ہے، "نے" کے متعلق میں نے تفصیل سے لکھا تھا کہ "بولا" متعدی کے آلی فاعل (ag enz آ) "نے" آنا چاہئے، اور وہ "دو جلے بولا" "مرد جھوٹ بولا" کو "اس نے دو جلے بولے" اور "مرد نے جھوٹ بولا" یوں کہنا چاہئے، اثر صاحب اس پر تبصرہ فرماتے ہیں،

"پروفیسر صاحب نے غور نہیں فرمایا کہ فرق دراصل "وہ" "اس" کے استعمال کا ہے "وہ" کے ساتھ "نے" آ ہی نہیں سکتا، اور "وہ" پر نہ تو ان کا اعتراض ہے، نہ ہو ہی سکتا ہے،

"اس" "وہ" کی غیر فاعلی حالت ہے، جہاں "وہ" پر "نے" "سے" "میں" "پر" وغیرہ حروف میں سے کوئی حرف آیا، اور "وہ" "اس" ہوا جیسے "وہ بولا" "میں نے نہیں" "اس نے جھوٹ بولا" "نے" آتے ہی "وہ" روپ بدل کر "اس" ہو گیا، میرا اعتراض "وہ" پر نہیں "نے" "نہ لانے" پر ہے، یہ دوسری بات ہے کہ "نے" آجانے کے بعد "وہ" "وہ" نہ رہے، "اس" ہو جائے، اتنا تو سوچا ہوتا کہ "مرد جھوٹ بولا" اس پر بھی اعتراض ہے

یہاں تو سرے سے وہ ہی نہیں، اگر وہ سے آپ کو محبت ہی، تو اسے چھوڑیئے، "مین دو جلے بولا"
کو "مین نے دو جلے بولے" یون کہیے، اس مین تو وہ اور اس کا فرق نہین، اس مین کیا اعتراض ہی، آپ
کو "نے" سے "پنجابیت" جھانکتی معلوم ہوتی ہے، اور مجھے "مین دو جلے بولا" سے اودھیت ٹپکتی نظر آتی ہی،
معیار زبان کے عام اصول ہین، اردو مین "نے" ہر فعل متعدی کے فاعل (ذاتی) پر آتا ہے، "مین دو
جلے بولا" مین بولا بھی متعدی ہے، پھر "نے" کیون نہ آئے، آپ زبان کے عام اصول نیز اہل زبان
کے عام استعمال کے خلاف "نے" ترک کر دیتے ہین، اس لئے ہم آپ کی اس انوکھی حرکت کو اودھیت
بتاتے ہین، ہم زبان کے اصول اور مزاج کے مطابق بولتے اور لکھتے ہین، ضد کی اور بات ہے، ورنہ
آپ ہمارے اس فعل کو پنجابیت سے کیسے تعبیر کر سکتے ہین، کیا صرف "نے" آجانے کی وجہ سے؟ اگر
یہ بات ہے تو آپ آج سے عہد کر لیجئے کہ "نے" کا ہرگز استعمال نہ کرین گے، تب خوشی کے ساتھ
پنجابیت کا الزام دیجئے گا۔

"بولا" تو لازم بھی ہوتا ہے، "پڑھا" تو کسی منطق سے بھی لازم نہین، آپ کے عالم و عامی سبھی
اس کو بغیر "نے" استعمال کرتے ہین، "اور اس نے خوب پڑھا" کو "وہ خوب پڑھا" کہتے ہین، (افادات
نظم طباطبائی مطبوعہ نگار دسمبر ۵۱ء ص ۳۰) "خوب پڑھے ہین"، اکثر لکھنؤیون کی زبانی سنا گیا ہے، یہ
اودھیت نہین تو اور کیا ہے، بہادر شاہ ظفر کا یہ شعر لکھ کر

ہم نے ہے اس کی ادائے ناز پہچانی ہوئی
چال پہچانی ہوئی آواز پہچانی ہوئی

حضرت اثر فرماتے ہین کہ

"دہلی کی اردو پر اس کی پڑوسن پنجابی کے کتنے ردے جمے ہوئے ہین"

غلط! سراسر غلط! یہ دہلی کی اردو نہین، دہلی والے ہرگز اس طرح نہین بولتے، جلال کی
طرح یہ ظفر کی اپج ہے، مولانا آزاد کے دو ایک جملون کو چھوڑ کر جو بقول مولانا قادری عمر بھر پنجاب

مین رہنے کے سبب سے پنجابی روزمرہ بولنے لگے تھے، کسی اور دہلوی اہلِ قلم کے یہان اثر صاحب
"نے" کا یہ استعمال نہ دکھا سکین گے، مولانا نظم طباطبائی کی رائے بھی یہی ہے، وہ تو کٹر لکھنوی ہین،
حضرت اثر ان کی رائے کے سامنے ضرور سر جھکا دین گے، وہ فرماتے ہین کہ دہلی کے تمام شعراء مثلاً
ذوق، مومن، غالب نے اس محاورے سے احتراز کیا ہے، اور ان کے بعد تسلیم، صابر، مجروح، اور داغ
نے کہین بھی اس طرح "نے" کو استعمال نہین کیا، سالک دہلوی مرزا نوشہ کے ممتاز شاگردون مین
تھے، حیدرآباد مین مرحوم ہو گئے، اکثر ان کا کلام مین نے سنا ہے، مجھے یاد نہین پڑتا کہ اس طرح
"نے" کا استعمال انھون نے کیا ہو،

حضرت اثر دریافت فرماتے ہین کہ اگر لکھنؤ کی اردو اودھی زدہ ہے، اور اودھی مین تذکیر و
تانیث کا کوئی معیار نہین، تو یہ اودھی زدہ اردو الفاظ و اسماء کی تذکیر و تانیث کے اصول منضبط کرنے
مین اتنی منہمک کیون ہے؟ اجی حضرت! تذکیر و تانیث کے اصول منضبط کرنا ہی اس امر کی دلیل ہے
کہ اودھی زبان بولنے والے لفظون کی فطرت، بناوٹ اور مزاج سے ناواقف ہین، وہ اُن کی جنس
نہین پہچانتے، اور شاید اسی لئے اصول اور ضوابط کے محتاج ہین، گرامر کے بارے مین، اتنی بات تو
سبھی جانتے ہین کہ قریب قریب ہر زبان کی گرامر غیرون نے لکھی، اہل زبان نے ہمیشہ اس کی
طرف سے غفلت برتی، انھون نے اپنے ذوق کو اپنا رہنما بنایا، عربی کی قدیم ترین گرامر سیبویہ کی کتاب
ہے، جو عجمی تھا، فارسی کی ابتدائی گرامر ہندوستانیون نے لکھی اور ہماری اردو زبان کی گرامر یورپ کے
مشرق دانون نے، زبان اصول اور ضابطے بنانے سے نہین آتی، اور نہ یہ اس کا ثبوت ہے، کہ اصول
بنانے والا زبان دان ہے، اصول اہل زبان کے روزمرہ کو دیکھ کر بنائے جاتے ہین، اثر صاحب بھول
گئے، انھون نے خود شاعروانہ مضمون کے آخر مین یہ فیصلہ کن بات کہی ہے، "زبان اور چیز ہے لکھنؤ کی ہو کہ
دہلی کی، یہ محض کتب لغات (کتب لغت کہئے یا صرف لغات) کے مطالعے سے نہین آتی، جب تک اُن

لوگوں سے کرید کرید کر نہ پوچھئے جن کی زبان ہے" میں نے ثابت کیا ہو کہ یہ اہل دہلی ہیں آخر انگلستان والے بھی تو اہلِ امریکا کے مقابلے میں اہلِ زبان ہیں،

رہا خود دہلی والوں کا بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث میں اختلاف سو وہ اس سلسلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا، ایک تو وہ گنے چنے لفظوں میں ہے، اور اس لئے محدود ہے، دوسرے وہ لفظوں کے مختلف معانی و مفاہیم پر مبنی ہونے کی وجہ سے اختلاف نہیں، سانس جن کے نزدیک مونث ہے "آہ" کے معنی میں ہے، جیسا کہ ظفر کے اس مصرعے میں،

ٹھنڈی ٹھنڈی جو کوئی سانس ہے آتی جاتی

تیسرے وہ اختلاف زمانے کا ہے، اب سے پہلے ایک لفظ مذکر تھا، آج مونث ہے" مثلاً" مالا" دہلی اور یوپی کے مغربی اضلاع میں آج مونث ہے، اور بقول علامہ نظم طباطبائی میر حسن کے زمانے میں مذکر تھا، ان کا شعر ہے،

وہ موتی کے مالے لٹکتے ہوئے رہیں دل جہاں سر پٹکتے ہوئے

لیکن مجھے شبہہ ہے کہ لفظ "مالا" کبھی دہلی میں مذکر بولا جاتا تھا، میر حسن کے شعر میں "مالے" کو علامہ نظم نے "مالے" پڑھ لیا، اور میر انیس کو سنا دیا، میں سمجھتا ہوں کہ اسی لئے انیس مرحوم نے یہ شعر سنکر تعجب کیا، وہ سوچتے ہوں گے کہ دادا جان، یہ کیا بول گئے، انیس مرحوم ہی کا ایک خاندان تھا، جو اپنی زبان کو لکھنوی اثرات سے پاک رکھ سکتا تھا، ایک یہی لفظ "مالا" حضرات لکھنؤ کے ذوق تذکیر و تانیث کے لئے دلیل رہ کافی ہے، یہ اسے مذکر بولتے ہیں کیوں، شاید اس لئے کہ اس کے آخر میں الف ہے، لیکن ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ اردو میں الف تذکیر غیر فاعلی حالت میں "ے" ہو جاتا ہے، جیسے "بگلا" اور "بگلے کے پر" اگر مالا کا الف علامتِ مذکر ہوتا، تو اہلِ زبان یوں کہتے "اس مالے کی قیمت کیا ہے" کیا حضرت اثر نے کسی غیر ثقہ اہلِ زبان کو اس طرح برتتے یا بگاڑتے سنا ہے؟

ایسی ہی لسانی بے خبری کا اظہار ہمارے محترم بزرگ سے اس مقام پر ہوا، جہاں "ہی" اور "ہیں" پر انھوں نے بحث فرمائی ہے، اعتراض یہ تھا کہ "ہی" اردو میں تاکید و حصر کے لئے ہے، دلی والے مفرد اور جمع دونوں صورتوں میں "ہی" (بغیر غنہ) بولتے ہیں، لکھنؤ والے مفرد کی صورت میں "ہی" کہتے ہیں، اور جمع کی صورت میں "ہیں"،

دلی والے "انھی" "ٹھی" "ہمی" اور "سبھی" کہتے ہیں، یعنی آخر میں "ن" غنہ اضافہ نہیں کرتے، لکھنؤ والے نون اضافہ کرکے "انھیں"، "ہمیں"، اور "تمھیں" بولتے اور لکھتے ہیں، (سالنامہ شاعر ۱۹۵۶ء میں ڈاکٹر ہاشمی کا مقالہ دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا فرق ملاحظہ فرمائیں) اثر صاحب نے اکتوبر کے شاعر میں اس کا جواب دیا ہے لیکن انھوں نے اس نقطے سے اختلاف کا اظہار نہیں کیا) سوال تلفظ اور ادا کرنے کا تھا، میں نے ثقہ یا غیر ثقہ کسی کو بھی اہلِ دہلی میں "ن" غنہ اضافہ کرتے نہیں سنا اور ثقات میں سے جو ذرا احتیاط برتتے ہیں، انھیں لکھتے بھی نہیں دیکھا، متاخرین اہلِ لکھنؤ سے کسی نے یہ اُپج کی اور جب یہ بدعت سنت جاریہ بن گئی تو سہل نگار کاتبوں نے "انھی" کو "انھیں" لکھنا شروع کر دیا، اثر صاحب کو ایک شگوفہ ہاتھ آیا، فرماتے ہیں، میر و غالب نے ہمیں اور تمھیں لکھا ہے، میر

ع تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میر

غالب:-

ع تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

میر و غالب نے نہ کبھی "ہمی" کو "ہمیں" اور "تمھی" کو "تمھیں" لکھا، اور نہ آج کوئی اہلِ زبان ان ضمیروں کو نونِ غنہ کے ساتھ پڑھتا ہے، یہ غلطی سہل نگار کاتبوں کی ہے، "سہل خوان" قاریوں کی ہے، اور "سہل نگار" شاعروں کی، میں دعوے سے کہتا ہوں کہ میر کے "ہاں" جہاں "ہی" صاف واضح اور پورا ادا ہوا ہے، وہاں کسی کاتب کا کوئی نشتر چلا، اور نہ حضرت اثر کا کوئی اثر ...... کا رگر ہوا، وہ صاف "ہی" ہے-

کام تھے عشق میں بہت تھے میر ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

ایک اور شعر ہے:۔

جاتے نہیں اٹھائے یہ شور ہر سحر کے یا اب چمن میں بلبل ہم ہی رہیں گے یا تو

مہدی مجروح کے ہاں بے شک "ہین" ہے، اور وہ لکھنؤ کا اثر ہے، ابھی کو لکھنؤ والے بھی سمجھی کہتے ہیں، حالانکہ سب معنی جمع ہے، میں نواب صاحب سے عرض کروں گا کہ اس انچ کی ہیچ بھی چھوڑیے، اور آئیے ہم آپ مل کر اعلان کریں کہ ہی کو ہین کوئی نہ لکھے، یہ غلط ہے، اور اردو کے مزاج کے منافی بھی،

سب سے زیادہ بامزہ اور لطیف بے خبری کی ایک واضح مثال تو رہی جا رہی ہے فرماتے ہیں "وہ اردو جو لکھنؤ میں بولی جاتی ہے، اس کا ماخذ وہی مغربی ہندی نہیں ہے، جو دلی کا ہے، (واہ! کیا نفیس زبان ہے، اور کیسا دل نشین انداز بیان! دلی کا ماخذ یا دلی کی زبان کا ماخذ) اگر ہے تو لکھنؤ والوں کی گھٹی میں تذکیر و تانیث کا شعور اسی طرح پڑا ہے، جس طرح دلی والوں کی گھٹی میں" یہ شدہ دو شدہ بے خبری بھی اور غلط فہمی بھی، کہا یہ گیا تھا کہ اردو مغربی ہندی کے حلقہ اثر (یعنی دلی اور میرٹھ) کی زبان ہے اور لکھنؤ اس سے باہر ہے اور سمجھا یہ گیا کہ لکھنؤ میں بولی جانے والی اردو کا ماخذ وہ مغربی ہندی نہیں، جو دلی میں بولی جانے والی اردو کا ہے، لکھنؤ اور دلی کے علاقوں کا فرق بتایا گیا تھا، اور انھیں جدا جدا دو لسانی حلقوں سے وابستہ دکھایا گیا تھا، حضرت اثر نے دلی اور لکھنؤ کی اردو کا فرق سمجھ کر یہ ثابت کرنا شروع کر دیا، کہ دونوں کا ماخذ ایک زبان ہے "یعنی مغربی ہندی" "ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ" (ایسے ہی موقع کے لئے ہے) یہ تو ہوئی غلط فہمی یا غلط فہمائی، "بے خبری" اس میں ہے کہ جب دلی اور لکھنؤ دونوں مقامات کی اردو کا ماخذ مغربی ہندی ہے تو لکھنؤ والے تذکیر و تانیث کے صحیح شعور سے کیوں بے بہرہ ہیں، ان کی گھٹی میں یہ شعور کیوں نہ پڑا؟ اتنی بات تو ایک بچہ بھی جانتا ہے، کہ یہ شعور ماحول کی پیداوار تھا، گردو پیش

کے مخصوص لسانی اور تہذیبی اثر کا نتیجہ تھا، اردو لکھنؤ میں اودھی زبان سے گھری ہوئی تھی، اس کے حامل و ناطق صرف وہ چند افراد یا خاندان نہ تھے، جو دلی سے اٹھ کر آئے تھے، ان میں وہ بھی تھے، جن کی زبان اودھی تھی، اور جو دیہاتوں سے لکھنؤ میں بستے آئے تھے، ان کی طبیعتوں میں اودھی رچی ہوئی تھی، ان میں تذکیر و تانیث کا صحیح شعور کہاں سے آتا، اور جو خاندان دلی سے گئے تھے، ایک دو نسلوں کے بعد لکھنؤ کے مخصوص ماحول اور اس کے لسانی اثرات نے تھوک تھوک کر ان کے مزاجوں میں بھی دخل پا لیا، اور ان کو اپنے رنگ میں رنگ لیا، پہلی قسم کے اردو بولنے والوں کو تو سرے سے تذکیر و تانیث کا شعور ہی نہ تھا، وہ ہاتھی کو مونث برتتے تھے، جس طرح بقول غالب اہل بنگال "تمھی آیا" کہتے ہیں، دوسری قسم کے لوگوں کا شعور اس درجے کا نہ تھا، جو دلی والوں کا ہے، اس لئے وہ کتاب پڑھا اور لفظ زبان سے نکلی کہنے لگے،

اثر صاحب فرماتے ہیں "اگر میں کہوں مغربی ہندی کی بولیوں میں بندیلی، برج بھاشا، قنوجی بھی شامل ہیں، اور یہ سب دہلوی اردو کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں، جس سے یہ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے لگی ہے، (ضرور کہئے لیکن خدا کے سوا ادعائی طور پر نہیں، ثبوت بھی پیش کیجئے) تو پروفیسر صاحب کو بغلیں جھانکنے کے واسطے نہ بن پڑے، اور اگر میں اضافہ کر دوں کہ اس مغربی ہندی میں پنجابی بھی سمو گئی ہے، تو پروفیسر صاحب پر راہ فرار مسدود ہو جائے"

اثر صاحب نے یہ اس لئے نہیں کیا کہ اس کا ثبوت دینا مشکل تھا، سنسکرت اور پراکرت زبانوں کی خاک چھاننی پڑتی، اور جب ادبی سیادت اور تنقیدی قیادت اس کے بغیر حاصل ہے، تو اس سے فائدہ؟ بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ کہیں بغلیں جھانکنی نہ پڑ جائیں، اور بعد میں راہ فرار مسدود نہ ہو جائے، اچھا یونہی سہی!!! لیکن یہ بات کیا ہوئی، اردو بھی تو برج وغیرہ کی طرح مغربی ہندی کی بیٹی ہے، اردو ان بولیوں کی گھٹی میں نہ پڑی، اور یہ بولیاں اس میں پڑ گئیں، کیوں؟ یہ بولیاں سب بہنیں بہنیں ہیں، سب نے ایک ماں یعنی مغربی ہندی کا دودھ پیا ہے، اسی لئے بہت سی خصوصیات میں یہ ایک دوسرے کی شریک ہیں، اس میں

آپ دخل دینے والے کون؟ ہان! اودھی اس خاندان کی نہین، وہ مشرقی ہندی کی بیٹی ہے، یہ اودھ ماگدھی گھرانے کی ہے، اور اردو شورسینی گھرانے کی، اردو کے لئے یہ اجنبی ہے، ادھر اردھ ماگدھی کی رشتہ داریان ماگدھی خانوادے مین بھی ہوئی ہین، جو عوام کالانعام (اثر صاحب کے نقطۂ نگاہ سے) کا خاندان ہے، اس جس کی وہی مثال ہے "باپ نہ دادے ہمارے خانوادے" شورسینی اونچی ذات کی ہے، اور ماگدھی نیچ ذات کی، اس کا اس کا میل کیا،

مغربی ہندی مین پنجابی سمو گئی ہے، یہ نہ معلوم ہمارے نواب صاحب نے کہان سے سن لیا، اس فن کے امام ڈاکٹر گریرسن کا قول تو یہ ہے کہ شورسینی اپ بھرنش کا (اسے اردو کی نانی کہئے) جب عروج ہوا، تو مغربی پنجابی تک اس کے رنگ مین رنگ گئی، مشرقی پنجابی تو مغربی ہندی ہی کی ایک شاخ ہے، (تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمایئے، ہندوستانی زبانوں کا جائزہ جلد نہم حصہ اول ص ۶۴۲) لیکن ان باتون سے فائدہ؟ اثر صاحب تو جڑ اور مول سے سروکار ہی نہین رکھتے، وہ تو شاخون مین جھولتے ہین،

(باقی)

شعر الہند حصہ اول

اس مین قدما کے دور سے لے کر دور جدید تک اردو شاعری کے تمام تاریخی تغیرات وانقلابات کی تفصیل کی گئی ہے، اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ ومقابلہ کیا گیا ہے،

قیمت :- ے،

"منیجر"

قائم چاندپوری

کا

غیر مطبوعہ کلام

از جناب محمد علی خان صاحب اثر رامپوری

(۲)

"اس مضمون کے پہلے نمبر مین مضمون نگار نے قائم کے حالات اور ان کے کلام پر مختصر تبصرہ کیا تھا، اس نمبر مین صرف ان کے غیر مطبوعہ اشعار کا انتخاب ہے جو غالباً ناظرین کے لئے غیر دلچسپ ہوگا، مگر اس کو صرف اسلئے شائع کیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ ایک قدیم استاد کے اشعار محفوظ ہو جائین، "م"

جس موضوع پر مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر عبد الحق صاحب اور مجنون گورکھپوری جیسے اصحاب علم و تحقیق داد دے چکے ہون، اور قائم کے کلام کے جواہرات کو چن چن کر ایوان ادب کو سجا چکے ہون، اس کے بعد صرف یہ یہی رہ گیا تھا کہ جو گرد آلود موتی نظرون سے مخفی رہ گئے تھے، ان ہی کو صاف کر کے قدر دانون کے سامنے پیش کر دیا جائے، چنانچہ مین نے حتی الامکان قائم کے مطبوعہ اشعار پیش کرنے کی کوشش کی ہے، مگر دیوان قائم کے مطبوعہ اشعار کا میدان اتنا وسیع ہے کہ یہ یقین کے ساتھ نہین کہا جا سکتا کہ ان کا کونسا شعر مطبوعہ ہے اور کون غیر مطبوعہ، مین نے حتی المقدور ان اشعار کا انتخاب کیا ہے، جو میرے علم مین غیر مطبوعہ ہین، اگر اس کے باوجود ان مین سے کچھ اشعار مطبوعہ نکل آئین تو ان کو قند مکرر تصور کیا جائے،

پھرے ہی یان سے رکھ اپنی شمیم کو کہ نسیم — نہین حریف اس آسیب کا دماغ مرا

صبر و طاقت کو دو دن یا دل کو ۔۔۔ لگ پڑی آگ گھر میں تھا سو جلا
کیا جانتے تو تھے قائم ۔۔۔ لیکن اپنے سے دل کا بس نہ چلا

نظر میں کعبہ کیا ٹھہرے کہاں ہم ۔۔۔ رہا ہے مدتوں مسکن ہمارا
ہوس سے ہم کیا تھا عشق اول ۔۔۔ وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

نہ جوں حباب جو طالب نمود کا کہ نہ ان ۔۔۔ مآل کار خرابی ہے خود نمائی کا
نہ پہنچا کان تک اُس تند خو کے حال مرا ۔۔۔ خدا بھلا کرے نالے کی نارسائی کا
کہاں ہو دیر کہ پوچھوں مغاں سے پیالہ کا ۔۔۔ ہے پھر گھمنڈ طبیعت میں پارسائی کا

جا چکے ہم جب آپ سے پیارے ۔۔۔ کیوں نہ اس راہ سے اب آئے گا
کیجے کرنی ہو جو خرید و فروخت ۔۔۔ پھر اس پینٹھ میں کب آئے گا
اب تو قائم ہے کوچ ہی کی صلاح ۔۔۔ یوں گھرا تا ہے پھر جب آئے گا

اس منہ سے کلام کچھ نہ نکلا ۔۔۔ جز یار کے نام کچھ نہ نکلا
بندے ہیں تھیں ہزار مجھ سے ۔۔۔ گو ایک غلام کچھ نہ نکلا
سوچے تھا میں قافیے کو قائم ۔۔۔ جز نام اکام کچھ نہ نکلا

نخل بے بر ہوا اس چمن میں وہ شخص ۔۔۔ جس سے کچھ خیر کا نہ کام ہوا

تک بھیج صبا کہ ہر قدم پر ۔۔۔ اس کوچے میں ہے غبار میرا
ناصح بولے ہے یوں کہ گویا ۔۔۔ دل پر ہے کچھ اختیار میرا

صحبت نیک و بد سے یاں دل گر ۔۔۔ کب تلک درد سر اٹھائیے گا
بند کر بیٹھیے در خانہ ۔۔۔ ایسی فرصت کو پھر نہ پائیے گا

بہت سا غور کرتے دخل دو نسخے میں عالم کے ۔۔۔ کہ حاصل دور ہو نظروں سے تیری اس رسالے کا۔

جی تلک آتش ہجراں سے سنبھالا نہ گیا ۔۔۔ گھر میں سب کچھ تھا یہ ہم سے تو نکالا نہ گیا
اوجھل اس ہستی کے تنکے کے یقینی تھا پہاڑ ۔۔۔ یہ پر کاہ ہے پر نظروں سے ٹالا نہ گیا

نیک و بد جو تجھے کرنا ہے سو کر لے قائم ۔۔۔ پھر امید نہیں یہ کہ جوان ہووے گا

جوں لالہ داغ سینہ سے کیا کام تھا ہمیں ۔۔۔ یا رب برا ہو اس دل درخوں نشستہ کا
وضع شباب عالم پیری میں رکھ نہ دوست ۔۔۔ کب رہوے ہے پھر کماں کی طرف تیر جستہ کا

کیا خضر کیا مسیح نے تیری گلی وہ جانے ۔۔۔ جو واں گیا سو باندھ کے سر سے کفن گیا

کہو کہ گور غریباں میں رکھیں قائم کو ۔۔۔ کہ اس کا جیتے بھی اکثر وہیں ٹھکانا تھا

اے کہ چاہے ہے تو دیوانگی قائم کی تو دیکھ ۔۔۔ کہیں ہوگا کسی خمار کی دکاں میں پڑا

عرصہ عمر جس کا نام ہے آج ۔۔۔ برق تھی یا شرار تھا کیا تھا

میں کیا کہوں کہ جو کچھ مجھ پہ زیر دام ہوا ۔۔۔ وہی یہ سمجھے جو تڑپا نہ اور تمام ہوا
سراے دہر عجب دلفریب ہے کہ جہاں ۔۔۔ خبر ہے کوچ کی بھولے جو ٹک مقام ہوا
یہ چاک جیب بھی سینا عبث ہے گر ناصح ۔۔۔ جگر کے زخم کا تجھ سے نہ التیام ہوا

بزم خوباں میں نہ بے ادبانہ آ اے بوالہوس ۔۔۔ ہو تو واضع طور اس مجلس کا اور ادب داب
حلقہ ساں بیرون در قائم رہی کب تک مقیم ۔۔۔ کھول دو اس کے بھی منہ پر یا الٰہی اب باب

کس نام سے قائم میں تجھے کہہ کے پکاروں ۔۔۔ اے خار در مسجد و اے ننگ خرابات

عیش یک شب کا بھی سامان دنیا ہو ۔۔۔ رہن مے ہم نے کیا جبہ و دستار بہت

چاہیے اگر گل کو تری نشو و نما ہو ۔۔۔ دل کھول کے دانے کی طرح خاک میں مل آج

واللہ ہوں میں تو مستی پہ تجھ چشم کی گستاخ ۔۔۔ پیتے ہیں مے یہ ہیں مقام حرم کے بیچ
کس کو دی قائم فلک نے منت یا نشو و نما ۔۔۔ خاک سے جب تک نہ یکساں کر لیا دانے کی طرح

جمع کیوں صبح و شفق چرخ پہ رہتی ہیں مدام
گریۂ سرخ نہیں لازمۂ موے سفید

اہلِ جوہر کو ہے کیا خاک نشینی سے زیان
نگینے ہوتے ہیں کب گرد سے لولوے سفید

سالکِ عشق کو لازم ہے کرے ترک قیود
جو تناور ہے، اگر ہو وہ برہنہ بہتر

دل میں اپنے نہیں کوئی جز یار
لَیسَ فی الدار غیرہ دیّار

داغ اشک آستیں سے اڑتے ہیں
مفت جاتی ہے ہاتھ سے یہ بہار

نے کُلہ کا جی میں یاں خطرہ نہ افسر کی ہوس
دین و دنیا سے اُدھر کچھ ہے قلندر کی ہوس

حال دل کا نہ پوچھ کچھ قائمؔ
آئے ہے اب تو آپ کو بھی ہراس

پھک ہی جائیگی کس شعلہ رو کی نذرِ نظر
کہ پوجتا ہے برہمن کنشت میں آتش

سر فروشی کے مخترع ہم ہیں
گو اب اونچی دکان رکھتی ہے شمع

راتوں جاگے ہے مثل قائمؔ کے
تب یہ سوز بیان رکھتی ہے شمع

اگرچہ داغ ہیں لالے کے دل میں جا طرف
نہ یہ ستم کہ جلایاں جگر ہزار طرف

لکھ اشتیاق نامہ تو کاتب پہ اس طرح
ظاہر نہ حرفِ شوق ہو بے نام اشتیاق

اس دشت پُر خطر میں ہمارا اگا ہے نخل
پہنچا کوئی نہال نہ جس میں ثمر تلک

قائمؔ میں اختیار کیا شاعری کا عیب
پہنچا نہ کوئی شخص جب اپنے ہنر تلک

دیکھ گل گوشۂ دستار پہ اسکی قائمؔ
تو نے دیکھا جو نہ ہووے کہیں گل بر سرِ گل

ساقیا عہد جوانی ہے نہ ہم سے ہو ملول
توڑیں مستی میں جو ہم ساغرِ گل بر سرِ گل

وہ بُت کہ شیخ جسے تو الٰہ کہتا ہے
جو معجزات کا سمجھے اسی کا ہے برہام

سیکڑوں دن میں آگئی غفلت کے بھی اب تب میں
دیکھتا ہے آدمی کیا کیا تماشا خواب میں

لوثِ عصیاں نہ گیا فرد سے اپنی قائمؔ
گرچہ اک عمر ہوئی دیدۂ تر دھوتے ہیں

گر زیست اس طرح سے جہاں میں بعد مرگ
نفریں کہے کوئی نہ اگر آفریں کہیں

قائمؔ جو اعتبار سے رتبے کے دیکھیے
کم آسمان سے شعر کی تیرے زمیں نہیں

جو چاہے روشنیِ دل تو داغ عشق اٹھا
کہ گھر وہ تیرہ ہے جس میں کہ ماہتاب نہیں

مے پی جو چاہے آتشِ دوزخ سے تو نجات
جلتا نہیں وہ رخت جو ہو تر شراب میں

آنسو مرے نہ خشک ہوں کیونکر ترے حضور
نورِ ستارہ پیش مہ چار دہ نہیں

آئے اثر ملازم سرکار گریہ ہو
یاں جز جگر خزانے میں تنخواہ ہی نہیں

ہے قادر تو خدا لیکن بتاں بھی
وہ کر چکتے ہیں جو کچھ ٹھانتے ہیں

اے دل! افسردگی داغ سے کیوں ہے تو ملول
جو گل اس باغ میں آتا ہے خزاں ہے اسکو

قصہ بوہنہ پائی کا میری اے مجنوں
خار سے پوچھ کہ سب نوک زبان ہے اسکو

حال قائمؔ کا میاں آج نہایت ہے تباہ
جانو تو بند تم اس خستہ کی آزاد کرو

یکدم میں ہم وجود سے یوں پہنچے ہیں عدم
لے جائے جیسے باد کا جھونکا حباب کو

قائمؔ سخن مرا ہے جس انداز سے یہاں
وہ زمزمے ہیں یاد کہاں عندلیب کو

موتی صدف سے نکلے ہیں قائمؔ کب اس طرح
ڈھلتی ہے بات منھ سے ترے جس صفا کے ساتھ

ہوں میں وہ گبر کہ اسلام میں ہوں رہزنِ دین
وضع پہ جائیو مت کوئی مسلماں میری

اے گریہ کب کہا میں گرہ در گلو نہ ہو
پر اس قدر دے راہ کہ ٹک جی نکل سکے

مسجد سے گر تو شیخ نکالا ہمیں تو کیا
قائمؔ وہ مے فروش کی اپنے دکان ہے

غافل بہار عمر کی آخر ہے پی شراب
پیمانہ بھر چکا ہے مبادا چھلک پڑے

شرابِ عشق میں کیا جانے کیا بلا تھی ملی
کہ جس کے کیف کا اب تک خمار باقی ہے

گئی نہ ہم سے اضافت وجود کی کہ تمام
جواب نہیں تو ہمارا غبار باقی ہے

لکھیو تو صبا کہ ہم صفیرو
ملنے گا جو بال و پر رہیں گے

نو غم بُرا ہے نہ عیش و نشاط بہتر ہے
سبھی مساوی ہیں یاں یہ فقیر کا گھر ہے

کرے ہے آئینہ کیا آستین سے تو صاف
ترے تو ہاتھ سے عالم کا دل مکدر ہے

ہماری چشم سے سیکھے کرم کوئی، کہ سدا
گہر یہ بخشے ہے تس پہ بھی نم سو تر ہے

موتی سے آنسوؤں کو نہ کھو رائگاں تو چشم
دولت خدا نے دی بھی تو اترا نہ چاہیے

شیخ جی گر ادھر ہوں میں بھی کروں کچھ التماس
آپ تو خاطر میں جو آیا سو فرماتے رہے

ہاتھ پھیلائے تو مثل برق ملنے کو ترے
لیک اک جھمکے میں ہم تو آپ جاتے رہے

صورت میں تری گر نظر آوے ملک الموت
جی دینا کسی طرح سے دشوار نہ ہووے

پاک طینت ہے یاں وہ اے ساقی
جس کے دل کا غبار مے دھووے

آہ کیا جنس وفا جل نہ بجھی سینے میں
طرح اس گھر کے کہ ناگاہ جسے آگ لگے

بو نہ یاں تخم آرزو اے ہوس
کب یہ دل قابل زراعت ہے

حقا کہ نہیں کچھ حق و باطل سے مجھے کام
فرمائیں جو کچھ آپ مرے حق میں وہی ہے

مت جا نثار دم پہ قائم کہے تو اک بیمار ہے
یہ خستہ فی الحقیقت مدت سے مر چکا ہے

کیا جانے ہم کہاں ہیں اور دین و دل کدھر ہے
عالم میں تفرقے کے کس کی کسے خبر ہے

آرام سے کوئی دم کٹ جائے گر جہاں میں
ہم عمر صد خضر کی اک فرصت شمر رہے

اس جوش خانے سے مت پوچھ کہ جا کیدھر
ہو گئی واں سے تجھے کچھ اک دو دن یاں رہیے

قائم اب رخت سفر باندھ کہ یاں سو ہے
جی تو جانے کو نہ چاہے تھا پہ ناچار چلے

درد و غم، داغ، ہجر اک کا ہے مجھے پاس متاع
جو کوئی شخص نئے شہر کو آباد کرے

شعور تجھ جبیں کا گر عالم ہوئی میں نہیں
در و حرم جہاں کے بیچ کیوں پردۂ زنگاری ہے

جو دیکھتے ہو اس میں خیالات و خواب ہے
دنیا بھی اک نمونۂ موج سراب ہے

ہوتی نہیں شمار نفس میں کبھی تمام
یارب یہ شب مری ہے کہ روز حساب ہے

نہ کر تکیہ حسن عمل پہ کہ زاہد
یہ کس کو خبر ہے کہ انجام کیا ہے

نکل گئے ابر سے کھینچ ہے برق خندہ زناں
کہ خوب رو ہیں گر نیاں سیاہ کاروں سے

کھلی گرہ کی نہ جب ناخن صدف سے گرہ
کشاد کار کی پھر کیا طمع ہے یاروں سے

نہ شیخ منکر کے ہو کہ دیدہ ور ہیں جو مرد
طلب کریں ہیں وہ ہمت شراب خواروں سے

رکے کیا تم سے جو کچھ ہے چکنا ہو نادان شتاب
وہ مسافر آج کل چلنے کی تیاری میں ہے

احساس نہیں خلق کی نظروں میں وگرنہ
جوں شمع یہ سب بزم نموداری مجھ سے

خوشا حال ان مریضوں کا کہ جن کا وقت یوں گذرا
کہ اندیشہ نہ استقبال کا نے قصۂ ماضی

رے معشوق سے قائم اگر خوش ہو تو وہ جانے
مجھے کیا کام ان قصوں سے میں ملا ہوں یا قاضی

قائم رہ پر خوف ہے، اور دور ہے منزل
کب پہنچے گا ظالم جو نہیں رات کی تو تنے

بار و نخل سے سیکھے کوئی احساں کا طریق
سنگ مارے ہے جو اس کو وہ ثمر دیتا ہے

جوں حباب اپنا فلک تازہ بنا لیجئے گا
فرصت اک دم بھی یہی چرخ اگر دیتا ہے

نقد ہستی کو پرکھنا نہیں آسان قائم
وہی سمجھے ہے، خدا جس کو نظر دیتا ہے

یہ نیست و ہست اے دل سب ہم ہی تک ہے
جب تھا تو بھلا کیا تھا اور اب نہیں تو کیا ہے

اس گل کا وہ ہے جس سے باندھے کوئی گلدستہ
گو ہیچ ہوں پر مجھ سے جمعیت دلہا ہے

یوں آدمی کہلا دے ہر گربہ و سگ لیکن
جس سے کہ عبارت ہے انسان وہ عنقا ہے

منت فقط ہے ورنہ، سیر وجود و درنہ
آئے نہیں عدم سے یا پھر عدم نہ ہوں گے

مثنوی نماز مع حکایات متعلقہ نماز

بنام طراز ندہ جسم و جان   کہ رکھتا ہے ہر تن میں حکم روان

یہ عالم ہے سب اک معین وجود   وہ ہے بود اس کی یہ محض اک نمود

درین پردہ یک رشتہ بیکار نیست   سر رشتہ بر ما پدیدار نیست

مین شب کنجِ مسجد مین تھا سر بجیب   سے دیدہ و دل بانعامِ غیب

کہ یارون نے وان کی یہ قال و مقال   کہ زائل ہوا اہلِ خلوت سے حال

کے تھا اک ان سے کہ وقتِ نماز   ضروری ہے اس مرتبہ امتیاز

کہ سمجھے تو دل سے کہ پڑھتا ہون کیا   ہے آیا یہ وقتِ فجر[1] یا عشا

کہا دوسرے نے کہ دل کا حضور   ہے اتنا بھی نیت ہو کرنی ضرور

کیا اس مین اک دوست نے یہ سوال   کہ اے تجھ سے آباد ملکِ کمال

جو ادھر ترا آئے تھوڑا سا عزم[2]   سہولت سے ہو جائے یہ بات نظم

نہ تھی بسکہ کہنے سے ان کے گزیر   لکھا مین یہ احوالِ عبرت پذیر

زبس نقشِ گفتار تھا دلپذیر   ہوئے محو سنتے ہی برنا و پیر

فراہم ہوئے جب وہ سارے نکات   رکھا نام اس کا مین رمز الصلات

سن اب اس طرف اے خداوندِ ناز   کہ ہو کس طرح پر جہان مین نماز

ہے اول تو اک طورِ خاص و عوام   کہ جس کو نہین کچھ خدا ساتھ کام

جو دیکھا کہ یہ فعل کرتا تھا باپ   اسی رسم و عادت پہ چلتے ہین آپ

جو دے نفع ان کو رکوع و قیام   تو اتنا کہ حرکت سے ہضم طعام

کرین طرح طوطے کے ذکر اللہ   پہ ذکرِ زبان کو نہین دل سے راہ

---

[1] نسخہ فجر کی میم ساکن ہے غالباً قائم بول چال کے تحت فجر لکھا گیا ہے۔ [2] عزم کا قافیہ نظم محل نظر ہے۔

ہے ہر چند ظاہر مین یہ فعل نیک   یہ واقع مین کرنا نہ کرنا ہے ایک

یہ تقلید اٹھ بیٹھ کرتے ہین سب   نظر مین نہ مطلوب ہے بے طلب

سو یہ عضو تیرے جو ہوتے ہین خم   سر و دست و زانو و پشت و شکم

ہے اس سے یہ مطلب کہ اے مردِ راہ   تو سب تن سے ساجد ہو پیشِ الٰہ

ہے جیسے تصور طریقِ نماز   تو کر جان و دل سے خضوع و نیاز

نہ یون جس طرح سے کہ کرتے ہین ہم   کبھی راست ہوتے ہین اور گاہ خم

سوم اہلِ تحقیق کی ہے نماز   حقیقت کا در جن کے منھ پر ہے باز

کہ جب سدرہ قرب مین ہون وے جا   نہ جبریل کو ہمرہی کا ہو بار

سنے گوشِ دل جب یہ قانونِ راز   ہو تارِ نفس خود بخود نغمہ ساز

کہ یا رب تجھی سے ہے توفیق بس   کہ بانی سے ہے جنبشِ مست خس

کھڑے ہو دین جس وقت بہرِ نماز   کرین سو طرح سے خضوع و نیاز

تراشین تخیل مین اپنے خدا   وہ حاضر ہو جون بندہ نظرون مین آ

کہین دل مین اس کو یہ معبود ہے   ہین ساجد ہم اس کے یہ مسجود ہے

رکھین سر زمین پر جو بہرِ سجود   تصور مین دیوین خدا کو وجود

کہ یہ سر ہے پائون سے اسکے قریب   ہمارا سر اور قسمت یا ہے حبیب

ہوا کیا جو کین سیکڑون فکر و غور   نہ سمجھا جو کچھ تھا سمجھنے کا طور

یہ سمجھے ہین دین جس کو ہے کفر فاش   ہین آذر کے مانند سب بت تراش

یہ خود بین ہین ہرگز خدا بین نہین   سدا آپ پوجے ہین اپنے تئین

جہان تک ترا وہم کھینچے وصف   خدا اس احاطے سے ہے اس طرف

چنانچہ سنا ہے یہ میں حرف راز ۔۔۔ کہ جب حضرت شاہ پڑھتے نماز

ز بس آتش شوق ہوتی تھی گرم ۔۔۔ تن پاک جوں موم ہوتا تھا نرم

ہو جب تک کہ تو آپ سے با خبر ۔۔۔ تجھے اس سے اے بے خبر کیا خبر

یہ بُت اولاً آپ سے کر جدا ۔۔۔ کہ ہو جلوہ گر تجھ میں نور خدا

کہ تا با خودی در خدا راہ نیست

درین نکتہ جز بیخودا آگاہ نیست

خیالات کی یکسوئی کی تمثیل ایک عورت پانی سے بھرے ہوئے چند گھڑے سر پر لئے جا رہی تھی، راستے میں سہیلیوں سے باتیں بھی ہو رہی تھیں، سر اور آنکھوں کو چاروں طرف حرکت بھی دے رہی تھی، دیکھنے والے کو تعجب تھا کہ ان مسلسل حرکتوں کے باوجود گھڑے کیوں نہیں گرتے، دریافت پر عورت نے جواب دیا کہ اگرچہ میرے ہاتھ پاؤں، سر اور آنکھیں سب حرکت میں ہیں، لیکن میرا دھیان گھڑوں ہی کی طرف ہے، جو ان کی نگہبانی کر رہا ہے،

وے تھا جو دل کو سبوچوں سے راہ ۔۔۔ وہ گرنے سے رکھتا تھا ان کو نگاہ

جو ہم کو بھی حق سے ہوا آشنا لگاؤ ۔۔۔ کہ یاد اس کی ہو جائے دل کا لبھاؤ

کسی کام کے بیچ ہو اشتغال ۔۔۔ نگہ سے ادھر ہووے دل کا خیال

تو مردوں کی صف بیچ ماریں قدم ۔۔۔ نہ ہوویں حقیقت میں اس زن سے کم

دنیوی تعلقات کی نفی روحانی ترقی کا باعث ہے

ہے یوں یاد وحشت کے عالم کی بات ۔۔۔ کہ گذری تھی درد اور نالے سے رات

سحر کو ہوئی خواہش سیر باغ ۔۔۔ کہ ہووے اسی طرح دل کو فراغ

بہر حال جا کر جو پہنچے میں واں ۔۔۔ نظر آ گیا مجھ کو اک باغبان

لئے ہاتھ میں تیغ دیوانہ وار ۔۔۔ درختوں سے کاٹے تھا وہ شاخسار

کہا میں کہ اے شخص کیا حال ہے ۔۔۔ علی الرغم تیری تو یہ چال ہے

ہے لازم تجھے پیڑ کا پالنا ۔۔۔ نہ یکبارگی قطع کر ڈالنا

لگا کہنے ہنس کر کہ سن اے فہیم ۔۔۔ نہیں خالی حکمت سے فعل حکیم

نہ کیجے اگر قطع یہ شاخسار ۔۔۔ نہ اشجار لاویں کبھو برگ و بار

شجر کو ترقی ہو بڑھنے میں کم ۔۔۔ نہ کیجے اگر شاخ اس کا قلم

ہے منظور اس کاٹنے سے یہ صرف ۔۔۔ کہ قوت نما کی نہ ادھر ہو صرف

غرض اس کا مطلب بظاہر تھا اور ۔۔۔ تھا دل میں گذرا یہ کرنے ہی غور

ہے انسان بھی اس باغ میں اک شجر ۔۔۔ علائق ہیں جوں شاخہا ہمدگر

گماں ہے جو تیرے اس کو سوئے علو ۔۔۔ ہر اس طرفہ اشجار کی وہ نمو

کرے قطع جب تک نہ یہ شاخسار ۔۔۔ ترقی اس عالم سے ہے سخت کار

غرض ہے تعلق ہی بے حاصلی ۔۔۔ جو پیوند ھا گسلی واصلی

خوشا حال مردان راہ خدا ۔۔۔ کہ مشغول طاعت ہیں بے دست و پا

تو جانے ہے کشتی میں بیٹھا ہو مرد ۔۔۔ وہ ہر لحظہ ہے آپ سے رہ نورد

پہ یہ بات ٹک فہم سے دور ہے ۔۔۔ نہ سمجھے اگر تو تو معذور ہے

کہ نکلے ہے جو کچھ بصیرت کا کام ۔۔۔ ہے حسن نظر اُس جگہ ناتمام

زبان گنگ کرتی ہے اس کی کیف ۔۔۔ جو سمجھا تو سمجھا نہ سمجھا تو حیف

مثنوی گرگ و گوسفند ۱۶ اشعر

شنیدم گوسفندی را بزرگے ۔۔۔ رہانید از دہان و دست گرگے

شبانگہ کارد بر حلقش بمالید — روانِ گوسفند از وے بلرزید

کہ تو نے گرگ سے مجھکو چھڑایا — پہ مین تو گرگ ہی تجھکو ہے پایا

سوا اس کے وہ کیا کرتا مرے ساتھ — کہ تین مجھ پر رکھا اشفاق کا ہاتھ

ہوئی جب جان ہی جانی مسلّم — تو جیسے گرگ پھر ویسے ہی آدم

اگر صد سال گبر آتش فروزد — چو یکدم اندران افتد بسوزد

مثنوی افسانۂ عشق درویش پنجاب مع حکایت قصۂ لیلے ۳۶۱ شعر،

الٰہی شعلہ زن کر آتشِ دل — تپِ دل دے بقدر خواہشِ دل

کر ایسا مشتعل داغِ جدائی — ہو روشن جس سے شمعِ آشنائی

بنامِ آنکہ عشق آموز دل ہے — چراغ افروز شمع سوز دل ہے

نہ ہو اس سے اگر ذرے کو تائید — اسے کیا رو کہ چاہے وصل خورشید

الا اے ساقی فرخندہ فرجام — ادب کی مے سے تو دانش کا بھر جام

کہ یان نقدِ فضولی ناروا ہے — نہین یہ حمد، نعتِ مصطفےٰ ہے

نہ ہے سرد فتنہ اربابِ ملت — مداوا بخش صد انواعِ علت

محمدؐ وہ کہ ہین جتنے پیمبر — ہین اس کے مرتبے سے سب فروتر

ہے جتنا کچھ کہ عالم مین ہویدا — ہوا اس کے لئے سب کچھ جو پیدا

خداوندا بپاسِ آلِ پیمبر — بحق باطنِ ہر چار سرور

ہین ہون گو قابلِ نارِ جہنم — پہ تیرے فضل کا دریا ہے کیا کم

آغاز داستان

شب اک ماتم سراے خانۂ عشق — بیان کرتا تھا یون افسانۂ عشق

کہ تھا پنجاب مین اک مرد درویش — گرفتار بلاے حالتِ خویش،

ہمیشہ دست دل سرپاے کوبان — سدا آشفتہ سرچون زلفِ خوبان

حزین عشق مانند دم سرد — لبان جان عاشق سر بسر درد

گدازِ تن سے تھا از خویش رفتہ — ہو جون مجو چکیدن موم تفتہ

ایک مدت کے بعد اس درویش کی محبت کا اثر محبوبہ پر بھی ہوتا ہے لیکن کب جب کہ وہ دنیا سے اٹھ جاتا ہے،

خوشا تاثیر جذبِ عشق کامل — سراپا ہے اثر جس سے ہر اک دل

کرے عاشق کا یہ ظالم اگر کام — نہ دے معشوق کو بھی ہرگز آرام

فسون سازی پر اپنی جب کبھو آے — جنازے پر نہین تو گور پر جاے

اسی صورت سے اس کافر کے ہین ڈول — چنانچہ ہے اسی راوی کا یہ قول

کہ جب وہ نازنین تکیہ مین آئی — جگہ درویش کی اک گور پائی

وہ نیشِ غم جو تھا خاطر مین دلسوز — ہوا جون نیش عقرب نالہ آموز

لگا کرنا وہ سے لے تا بماہی — نظر مین چھا گئی یکسر سیاہی

پکڑتے تھے اسے ہر چند احباب — پہ نکلے جائے تھی ہاتھون سے جون آب

اسے اس گور نے جس طرح کھایا — نہ ماہی نے بھی یون یونس در آیا

جو کوئی آیہ دگل سویان بناہی — مآل اس کا یہی آخر فنا ہے

چنانچہ نوحہ خوان بزمِ ماتم — کرے ہے اس طرح سے نالشِ غم

کہ اس حالت کو جب گذری کچھ اک دیر — لگا آنے نظر درویش کا ڈھیر

کہا سب نے کہ کھودین اس جگہ کو — ہو شاید اس تلک لے جائین رہ کو

جو کھولا گور کو تو وا فاگوش — تھے دونون ایک بغلی مین ہم آغوش

نہ کر سکتا تھا فرق ان مین کوئی فرد | کہ ہے زن کونسی اور کونسا مرد

نتیجہ

جو آیا اس گذرگہ مین سو گذرا | نہ وامق ہی رہا آخر نہ عذرا

نہین جز نام کچھ پیشین سے اب یاد | کہان شیرین گئی کیدھر ہے فرہاد

یہ کل ہوناہے اک فرصت سے غافل | کہ ہم مطلق معطل ہون توکل

یہی خورشید ہو وے اور یہی ماہ | یہی وضع زمانہ اور یہی راہ

بس اس صورت مین کیجے کس کا ماتم | ہو اپنا حال جا ے گریہ و غم

سخن ہو گرچہ اے دل شیوہ لب | یہ خاموشی کو کر تو پیوہ لب

کہ اکثر بات مین سہو خطا ہین | نہ کہنے مین یہ سب مطلب روا ہین

اٹھی سب بزم آیا وقت خفتن

ہو اب گفتن سے اولیٰ ترنگفتن

باقی

نواے حیات

از جناب یحییٰ اعظمی

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نواے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہین، دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن مین بہت سی نئی غزلون اور نظمون کا اضافہ ہے اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے، اس کے شروع مین مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ اور مولانا ابو الکلام آزاد کی ایک مختصر سی تقریظ ہے، جو بجاے خود قابل مطالعہ ہے،

قیمت مجلد:- للعہ

" غیر مجلد عہ

"منیجر"

موتمر مستشرقین استنبول

از

جناب مولانا سید بدر الدین صاحب علوی

گذشتہ مارچ کے معارف مین اس موتمر کی روداد ایک ایسے صاحب کے قلم سے شائع ہوئی ہے جو اس مین شریک تھے، اس کے بعد ایک ایسے شخص کا اوس کی بابت کچھ لکھنا جو شریک نہ ہوا ہو، بے محل خیال کیا جا سکتا ہے، لیکن امید ہو کہ جو کچھ مین پیش کرون گا وہ بھی دلچسپی اور فائدے سے خالی نہ ہوگا،

اس جگہ یہ عرض کرنا غالباً بیجا نہ ہوگا کہ اس موتمر کی تنظیمی کمیٹی کے صدر مشہور عالم پروفیسر ڈاکٹر زکی ولیدی طوغان نے (جن سے راقم الحروف کا غائبانہ علمی تعارف ہی) مجکو موتمر کا مطبوعہ دعوت نامہ بھیجنے ہی پر اکتفا نہین کی، بلکہ نجی خط بھی لکھا، مین سفر کے معاملہ مین بہت سست واقع ہوا ہون، باوجود اس کے مین نے اُن کی دعوت پر شرکت کا عزم کر لیا، دو وجہین اور بھی عزم کا باعث ہوئین، پہلی تو یہ کہ ابتدا ہی عمر سے استنبول کے دیکھنے اور وہان کے کتب خانون کی سیر کا شوق رہا ہے، وہ پورا ہوگا، دوسری یہ کہ دنیا بھر کے علماء کا جم غفیر وہان ہوگا، ان سے ملاقات ہوگی، خاصکر ایسے علماء جن سے علمی سلسلے سے تعلقات ہین، ان کے دید سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملے گا، اور تعلقات کا حقیقی لطف میسر آسکے گا، چنانچہ جہاں تک جہاز ران سے ہر قسم کے سفر کے متعلق تمام معلومات منگا لی تھین کہ اگست مین میری لڑکی کی شادی کی تاریخ کے متعلق خط وکتابت ہو کر ۲۷ ستمبر مقرر ہوگئی، جس نے میری تمام تر توجہ اپنی جانب مبذول کرالی، اور اس طرح مجبوراً ارادہ فسخ کرنا پڑا، یہ سچ ہے

ع عرفت ربی بفسخ العزائم

بہر حال ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے محولہ بالا مضمون نے چھ مہینے پہلے کی بھولی ہوئی چیز کو یاد دلادیا، اور طبیعت کا تقاضا ہوا کہ مین بھی چند سطور لکھ کر عدم شرکت کی تلافی کرلون،

اس موتمر کی مختصر تاریخ پیش کرکے استنبول کے اجلاس کی چند خصوصیات اور کچھ دوسری تفصیلات بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، چند مفید اور دلچسپ مقالون کا ذکر بھی موزون ہوگا، جو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی فہرست پر مستزاد ہون گے،

یورپ مین سیکڑون سال سے ایک جماعت ایسے علمار کی قائم ہے جو اپنی زندگیون کو مشرق اور مشرقی علوم کے لئے وقف کئے ہوئے ہین، ابھی خاصی تعداد ایسے لوگون کی ہر زمانہ مین رہتی ہے، "یہ لوگ مستشرقین کہے جاتے ہین، ہر ممکن کوشش کے ساتھ یہ لوگ قسم قسم کی خدمتین انجام دینے اور دنیا کے سامنے پیش کرتے ہین، ایسی انفرادی کوششون کو اجتماعی حیثیت دینے کے لئے اس موتمر کی بنیاد رکھی گئی، جو تین سال پورے کرکے چوتھے سال مین مختلف مقامات پر اپنا اجلاس منعقد کیا کرتی ہے، استنبول والے اجلاس سے پہلے اکیس جلسے اس کے ہوچکے تھے، یہ بائیسوان تھا، اس سے پہلے والا جلسہ ۱۹۴۸ء مین بمقام پیرس ہوا تھا، اور وہین آیندہ اجلاس بمقام استنبول طے ہوگیا تھا، چنانچہ یہان کے لوگون نے موتمر کی تاریخ انعقاد سے تقریباً ایک سال قبل انتظامات کا آغاز کر دیا تھا، ترکی کے محکمہ تعلیم نے دعوت نامے جاری کرنے کا کام استنبول یونیورسٹی کو سپرد کرکے طے کیا کہ انقرہ یونیورسٹی، ترکی انجمن لسانیات اور انجمن تاریخ بھی استنبول یونیورسٹی سے تعاون کرین، یونیورسٹی کے رکیٹر نے سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ مذکورہ بالا جماعتون کے نمایندے طلب کرکے ایک تنظیمی کمیٹی ملک کے ممتاز علمار کی ترتیب دی، جس کی صدارت جیسا کہ اوپر آچکا ڈاکٹر زکی ولیدی کو تفویض ہوئی، اس کمیٹی نے ملکی علمار اور مستشرقین سے مشورہ کرنے کے بعد طے کیا کہ استنبول کا اجلاس بمقابلہ پچھلے اجلاسون کے وسیع تر پیمانے پر منعقد کیا جائے کیونکہ استنبول کو مختلف حیثیتون سے

بڑی اہمیت حاصل ہے، وہ عیسوی غرب اور اسلامی شرق نیز یورپ و ایشیا کے درمیان اتصال کی کڑی ہے، پھر ترکی سلطنت کا علمی مرکز بھی ہے،

الغرض موتمر کو پندرہ شعبون پر تقسیم کرنا قرار پایا جن کی تفصیل یہ ہے،

مشرق قدیم، قدیم اناطولیہ، سامی علوم، اسلامی علوم، مشرقی ایشیا (چین جاپان و انڈونیشیا) وسط ایشیا، ترکی، ہندوستان، ایرانی علوم عیسوی مشرق، عہد عتیق، مصر قدیم قسطنطنیہ اور اسلامی آثار اسلامی فنون لطیفہ، مقالات، زیادہ آنے پر جہان ضرورت ہوگی شعبون کی شاخین قائم کر دیا جانا بھی پہلے ہی طے ہوگیا تھا، چنانچہ جیسا ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے لکھا ہے، متعدد شعبون کے ذیلی شعبے بنا دیئے گئے،

تنظیمی کمیٹی کے ممبرون نے مختلف شعبون مین حصہ لینے کے لئے مستشرقین سے ذاتی طور پر مراسلت شروع کردی تھی، مختلف ممالک مین جو تحقیقاتی کام مشرق پر ہو رہا ہے پوری کوشش کی کہ اس کی نمایندگی بڑے پیمانے پر ہوسکے، اسلامی ممالک کے علمی مرکزون اور نوزائیدہ اسرائیل، ہندوستان اور پاکستان سے خاص کر نمایندگی فراہم ہونے کا بیش از بیش انتظام کیا گیا، اجلاس کا انعقاد یونیورسٹی کے شعبہ جات قانون و اقتصادیات مین قرار دیا گیا، علمی نمایشون کا انتظام ہوا، اور تفریحی سفرون کے لئے مختلف مقامات مرکز قرار دیئے گئے، شرکت کرنے والون کے لئے ہر طرح کی آسانیان سفر کے متعلق مہیا کی گئین، قیام کے لئے اعلیٰ درجہ اور دوسرے درجہ کے ہوٹلون کو طے کرنے کے ساتھ مختلف کالجون کے کمرون کو بھی قیام گاہ بنا دیا گیا، اور کچھ مہمانون کو ترکی گھرانون مین بھی ٹھہرانے کا انتظام ہوا، تواریخ انعقاد پہلے ۳ تا ۱۰ ستمبر تھین، لیکن ایک اور کانفرنس جو غالباً سیاسی تھی، اور بین الاقوامی اس کی تاریخین یکم تا ۱۰ ستمبر بعد مین معلوم ہوئین، اس وجہ سے اس موتمر کی تاریخین ۱۵ تا ۲۲ ستمبر کردی گئین، روداد مین یہ پڑھکر بہت خوشی ہوئی کہ ہندوستان اور حیدرآباد نے اس موتمر مین کافی دلچسپی لی، اور حیدرآباد کے اصحاب نے جس ہمت اور شوق سے کام لیا، اس کی قدر بھی ہوئی، دائرۃ المعارف کی علمی خدمات کا اعتراف موتمر مین کیا گیا، یہ بات ہند وحیدرآباد کے لئے بڑے فخر کی ہے،

درحقیقت یہ خطہ ہمیشہ سے علم اور علمی خدمات مین بڑھ چڑھکر رہا ہے، امام غزالی فیضی، اور مرتضیٰ زبیدی وغیرہم نے کیسے کیسے جوہر دکھائے، جن کا لوہا تمام دنیا نے مانا ہے، غرض دائرۃ المعارف نے اس وقت بھی اس خطہ کی لاج رکھ لی، مصری عالم محمد رشاد جو اس وقت ہندوستان مین کتب خانون کا جائزہ لیتے پھر رہے ہین، انھون نے خود مجھ سے کہا کہ وہ خود اور تمام علمائے مصر دائرہ کی ان خدمات پر عش عش کرتے ہین، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تبدیل شدہ حالات مین بھی اس کو برقرار رکھے،

موتمر کا آخری پروگرام جو وہان پہنچنے پر ملتا، اس کو نہ دیکھنے کی وجہ سے جن مقالات کے عنوانات مین نیچے لکھتا ہون، اُن کی بابت یہ عرض نہین کر سکتا کہ ان مین سے کون کون مقالہ نگارون کی عدم شرکت کے باعث نہین پڑھے گئے، میرا خود مقالہ جس کا عنوان مادرزاد شاعر بشار بن برد کی غیر معمولی ذہانت تھا، میری غیر حاضری کی وجہ سے نہین پڑھا گیا، بہرحال اب مجھ سے چند مقالات کے نام سنیے،

۱- سامی کتبہ نویسی کا فن (ڈرینگر کیمبرج)

۲- شمالی و جنوبی سامی زبانون کے حروف تہجی کی ترتیب (جنی مین - ایڈنبرا)

۳- یونان و روما کے زمانہ مین حجاز کے متعلق چند معلومات، (میکنین واشنگٹن)

۴- ابن سینا کے فلسفے مین تصوف کا مظاہرہ (زیفی قاہرہ)

۵- کتاب الجوامل والشوامل (احمد امین قاہرہ)

۶- زعیم الملت والدین کی غیر مطبوعہ شرح منازل السائرین (رمود نیسوش قاہرہ)

۷- ابن باجہ پر نقد و نظر (ڈن لپ کیمبرج)

۸- ابن خلدون اور ویکابیین (فیشیل برکلے کالیفورنیا)

۹- اجتہاد، جدید عربی نحو مین (امین الخولی قاہرہ)

۱۰- قرآن کے استعارون اور مجاز کی تشریحات، (موسی - قاہرہ)

۱۱- ابن عساکر کی تاریخ دمشق کے ماخذ (منجد دمشق)

۱۲- عربی حروف کی آوازون کو دوسری زبانون مین ادا کرنے کا مسئلہ، (پاریجا - روما)

۱۳- مجاز القرآن اور اس کا اثر عربی علم اللسان پر (فواد سیزگین انقرہ)

۱۴- دمیری کی حیاۃ الحیوان میں علم طب (سومو گی بوڈاپسٹ)

۱۵- رسالۃ الغفران یورپی نثر مین (النساقی قاہرہ)

۱۶- اسلام کے علمی تشکیلات کے یونانی ماخذ (ویٹرہن پرنسٹن)

۱۷- ابتدائی مملوک حکومت مین شام کا شہری انتظام (زیادہ بیروت)

۱۸- یونانی مذہب پر وسط ایشیا کا اثر (سانڈ کیمبرج)

۱۹- قدیم ترکی قبائل (کلاسن لندن)

۲۰- ابن خلدون کے متبعین ترکون کا نظام (فندیق اوغلو استنبول)

۲۱- شرعی احکام اور یہودی ماخذ کی روشنی مین بیت المقدس پر ترکی حکومت، (ہرش برگ، اسرائیل)

۲۲- لاطینی رسم الخط مین ایک نامعلوم مختصر ترکی کتاب مورخہ ۱۴۶۹ء (ویل، اسرائیل)

۲۳- بہن نامہ (ریم پس، ٹیوبنگن)

۲۴- قدیم مصری شادی و طلاق کے متعلق چند مزید معلومات (مصطفی الامیر کیمبرج)

۲۵- قدیم مصر کے ساتھ بعض غیر ممالک کے تعلقات (مرے لندن)

۲۶- مصری فن تعمیرات پر عثمانی ترکون کے آثار ما بین ۱۵۱۷ء و ۱۸۶۵ء (حسن عبدالوہاب قاہرہ)

۲۷- قرون وسطیٰ کے آخر مین اسلامی و یونانی نقوش، (گرینوبام - شکاگو)

۲۸- شمالی نائجیریا مین مینارے کی تعمیر کا طرز، (شاخت - آکسفورڈ)

۲۹- عربی خطاطی و خوشنویسی، (مدیکا عمر، انقرہ)

۳۰- عیسائیوں اور مسلمانون کے درمیان مفاہمت کا خاکہ (اسمتھ مانٹریل)

میرے پاس جو پروگرام آیا تھا، اس میں تین سو سے زائد مقالات کے عنوان درج تھے، جن مین ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے بتلائے ہین، اور تیس کی فہرست مین نے پیش کی ہے، دونون فہرستون نے مل کر ایک تہائی بھی پیش نہین کیا، بہرحال یہ موتمر ایک عظیم الشان چیز ہے، جس کی تفصیلات کا بیان کرنا آسان نہین، موتمر کے بھیجے ہوئے مواد سے مین نے بہت مختصر طور پر چند سطرون مین کچھ حالات اوپر لکھ کر نذر ناظرین کر دیے۔

ادبیات

دورِ انقلاب

از

جناب شاہ ولی الرحمن صاحب ڈپٹی کلکٹر آرہ

پھر ارتقاے دہر کا سامان ہے آج کل — دنیا پھر انقلاب بہ داماں ہے آج کل

ذرّوں کو انتشار ہے قطروں کو اضطراب — پھر زلفِ کائنات پریشاں ہے آج کل

بکھری ہوئی ہیں عارضِ گل رنگ پر لٹیں — صبحِ چمن میں شامِ بیاباں ہے آج کل

لیلیٰ کو اب ہے چین نہ آرام قیس کو — دنیاے حسن و عشق پریشاں ہے آج کل

جوشِ جنوں ہے سر بہ گریباں کہ کیا کرے — دامن ہے ہاتھ میں نہ گریباں ہے آج کل

احساس اب کسی کو غمِ عشق کا نہیں — ہر دل میں کثرتِ غمِ دوراں ہے آج کل

زینت گلے کی جن کے تھی پھولوں کے ہار سے — دامن میں اُن کے خارِ بیاباں ہے آج کل

جاری ہے کائنات میں فرمانِ اہرمنا — بالاے طاق مصحفِ یزداں ہے آج کل

ظلمت کدہ میں شمعِ نبوت ہے مضمحل — بوجہل کا چراغ فروزاں ہے آج کل

ہے تختِ عیش پر متمکن عزیزِ مصر — چاہِ بلا میں یوسفِ کنعاں ہے آج کل

باقی ہے قہرمانیِ فرعون کی نمود — پنہاں عصاے موسیِ عمراں ہے آج کل

دوشِ ہوا پہ مست ہو سرِ مورِ ناتواں — خاکِ زمیں پہ تاجِ سلیماں ہے آج کل

تیغِ ستم یزید کی پھر ہے کھنچی ہوئی — خونِ حسینؑ زینتِ داماں ہے آج کل

ابلیس دے رہا ہے پیاپے فریبِ نو — آشفتہ حال خاطرِ انساں ہے آج کل

افراد جد و جہد میں سرگرم ہیں ولی — بزمِ وجود رزم کا میداں ہے آج کل

غزل

از جناب سروشؔ عسکری طباطبائی

ہمارے خوں کا ہر ایک قطرہ ہے جوہرِ برق کا خزانہ — ہم ایک دن بجلیوں کے دل میں بنا کے چھوڑیں گے آشیانہ

تمھاری رفتار ساحرانہ، تمھارے انداز قاتلانہ — اٹھا لو پرچم جو باغیانہ، جھکا لو قدموں پہ تم زمانہ

نہیں قسم عظمتِ سلف کی کہ دو قدم اور باغیانہ — بہ شیوۂ حسنِ سرفروشی، بہ عزمِ باکِ مجاہدانہ

ہمیں تھے جو بجلیوں کی زد پر بنائے خاشاک ہم رکھے رہے — بگاڑنا بھی جنھیں نہ آیا، وہ کیا بنائیں گے آشیانہ

زمانے کی یہ مجال کب تھی کہ تربیت کر سکے ہماری — ہمارے پاے رواں کی ٹھوکر میں آپ پلتا رہا زمانہ

نہ عیش و راحت نہ رنج و کلفت، نہ دین و دنیا نہ کفر و طاعت — غمِ محبت ہے بس حقیقت، بقیہ جو کچھ ہے سب فسانہ

عبث ہے ناصح تری نصیحت تجھے مبارک ہو تیری جنت — نہ دردِ یک لمحۂ محبت، نہ لذتِ عیشِ جاودانہ

تری طلب میں رواں دواں تھے، تجھی کو پایا تو ہم کہاں تھے — کھلا یہ آخر کہ تیرا ملنا ترے نہ ملنے کا اک بہانہ

وہاں ہے تدبیر چارہ گر بھی، سرِ دعا بھی، غمِ اثر بھی — یہاں ہے ہمدردیِ نظر بھی مزاجِ غیرت کو تازیانہ

عداوتِ آسماں کی کد میں، قلمروِ باغباں کی حد میں — ہجومِ برقِ تپاں کی زد میں بنا کے بیٹھا ہوں آشیانہ

غزل کی فرصت نہ تابِ محفل، کہاں تھا اس بزم کے میں قابل — مگر تہیجِ سخن سرائی، ہنر نوازی ہے جارحانہ

نہ جاؤ اسبابِ ظاہری پر، سروشؔ کی وضعِ کافری پر
مزاج اس کا ہے عاشقانہ، سخن ہے لیکن پیمبرانہ

لہ میرے نزدیک ایسے قوافی میں ایطا کی قدیم بحث اب ترک کر دینا چاہیے۔

غزل

از

جناب عارف عباسی

نگاہِ شوق میں شعلہ بھی شبنم
جز اک اللہ فتادِ سعی بہیم

ہوئی جاتی ہے چشمِ ناز بھی نم
نہ سنیئے اب مرا افسانۂ غم

رہے تنکوں میں جب ناربط باہم
بنائے آشیان اتنی ہی محکم

قیامت ہے ابھی تک گریۂ غم
نہ دامن تر نہ جیب و آستیں نم

جنابِ شیخ کا تقویٰ مسلّم
مری تر دامنی بھی کچھ نہیں کم

نکھرتی جا رہی ہے فکرِ انسان
سنورتا جا رہا ہے حسنِ عالم

اسی مرگ آفرین خود رفتگی پر
فریبِ زندگی کھاتے رہے ہم

نگاہِ عشق کی تر دامنی بھی
لئے ہے پاکیِ دامانِ مریم

ہر اک تخریب ہے بنیادِ تعمیر
ابھی ہونے دو برہم نظمِ عالم

جنونِ جانفروشی ہی نہیں جب
بنائے زندگی ہو کیا محکم

کبھی تھی بزمِ دل جس سے چراغان
وہی شعلہ ہوا اب آنکھوں میں شبنم

ہوا نے نگاہ تنکوں میں عارف
مکمل ہو چکا افسانۂ غم

مطبوعات جدیدہ

حیاتِ اجمل مؤلفہ جناب قاضی عبدالغفار صاحب، تقطیع بڑی ضخامت ۴۳۲ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ہے، پتہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڈھ،

حکیم اجمل خان مرحوم جیسی جامع کمالات شخصیتین اس زمانہ مین کم پیدا ہوتی ہین، اُن کے اوصاف اور کارنامے گوناگون ہین، ان کی پوری زندگی ملک و ملت اور قوم و وطن کی خدمت مین گذری، فنِ طب کے تو وہ ماہر و مجدد ہی تھے، طبی کانفرنس، طبیہ کالج اور ہندوستانی دواخانہ قائم کرکے انھون نے ہندوستان مین طبِ یونانی کی گرتی ہوئی عمارت سنبھال لی، اور اپنی حذاقت سے مخالفین تک سے اس کا لوہا منوا لیا، اس کے علاوہ لیگ، کانگریس، تحریکِ خلافت، ترکِ موالات، علی گڈھ کالج، مسلم یونیورسٹی، ندوۃ العلماء غیرہ خاص مسلمانون اور ہندو مسلمانون کی متحدہ جس قدر قومی، سیاسی اور تعلیمی و علمی تحریکین ہوئین، ان سب مین ان کا نمایان حصہ رہا، ہندوستان کی آزادی کی تحریک مین ان کی جدوجہد سب کو معلوم ہے، وہ ہندو مسلم اتحاد کا عملی نمونہ تھے، اور شروع سے آخر تک کانگریس کے ساتھ رہے، اُن کی سیاسی بصیرت اتنی گہری اور ان کی شخصیت اتنی باوقار تھی کہ اُن کی زندگی مین گاندھی جی اُن کے مشورہ کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتے تھے، مرحوم کی زندگی ہی مین فرقہ دارانہ مسائل اور کانگریس مین اختلاف و انتشار پیدا ہو گیا تھا، اور بڑے بڑے لوگون کے قدم ڈگمگا گئے تھے، مگر اس کوہِ وقار کے پائے ثبات مین کوئی لغزش نہین آئی، قومی و سیاسی کارنامون کے علاوہ ذاتی حیثیت سے مرحوم بڑے اوصاف و خصوصیات کے حامل تھے، فنِ طب مین حذاقت کے ساتھ عام علمی حیثیت سے ایک فاضل شخص تھے، عربی و فارسی دونون زبانون مین پوری دستگاہ

حاصل تھی، انگریزی سے بھی کچھ واقف تھے، مطالعہ نہایت وسیع تھا، فارسی اور اردو کے شاعر بھی تھے، اخلاقی حیثیت سے وہ انسانیت و شرافت کا پیکر اور پرانی شرقی تہذیب کی وضعداری کا نمونہ تھے، ان کے اخلاق و شرافت کے ایسے ایسے واقعات ہیں کہ آج کی تجارتی اور خود غرضی کی دنیا میں ان کا یقین کرنا مشکل ہے، انھون نے بڑی دولت پیدا کی، اور اس کا بڑا حصہ قوم و ملک کی راہ مین صرف کر دیا، ہندوستانی دواخانہ کی لاکھون روپیے سالانہ کی ذاتی آمدنی طبیہ کالج پر وقف کر دی تھی، ان کے اوصاف و کمالات کی تفصیل نہ مقصود ہے، اور نہ اس کا یہ محل ہے، ایسی جامع کمالات شخصیت کی سوانح عمری کی بڑی ضرورت تھی، اس فرض کو مرحوم کے پرانے رفیق انیس خلوت و جلوت اور اردو زبان کے کہنہ مشق ادیب شہیر قاضی عبد الغفار صاحب نے ادا کیا جن سے زیادہ موزون اس کام کے لئے دوسرا شخص نہیں ہو سکتا تھا، انھون نے یہ کتاب لکھ کر قومی فرض اور حق رفاقت دونون کو ادا کر دیا، اور اپنے زور قلم سے حکیم صاحب مرحوم کے کارنامون اور ان کے اخلاق و سیرت کا نہایت دلکش مرقع تیار کر دیا ہے، حکیم صاحب کی پوری زندگی قومی و ملی کامون مین گذری ہے، اس لئے ان کی سوانح عمری مین بیسوین صدی کے ابتدائی ۲۵، ۳۰ سال کی ہندوستان کی پوری سیاسی تاریخ، اس کی آزادی کی جد و جہد اس کے مد و جزر اور مسلمانون کی علمی و تعلیمی و مذہبی تحریکون کی پوری سرگذشت آگئی ہے، مصنف کے حسن انشانے کتاب کے حسن و دلکشی مین اور زیادہ اضافہ کر دیا ہے، یہ کتاب مختلف حیثیتون سے ہر محب وطن ہندوستانی کے مطالعہ کے لائق ہے، ہندوستان کی آزادی کے بعد سے اس کی سیاست نے ایک نیا رخ اختیار کیا ہے، اور جنگ آزادی کے مسلمان مجاہدین، بلکہ اس کے سرادل دستون کا نام ہی کہین آنے نہین پاتا، اور ان کو ہندوستان کی آزادی کی تاریخ سے مٹانے کی کوشش کی جارہی ہے، مگر ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہین، کسی کے مٹائے سے مٹ نہین سکتے،

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد بعشق   ثبت است بر جریدهٔ عالم دوام ما

ایک مشرقی کتب خانہ مترجمہ جناب مبارز الدین رفعت صاحب استاد شعبہ فارسی جامعہ عثمانیہ، تقطیع بڑی ضخامت ۱۱۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد سے رچہ:- انجمن ترقی اردو ہند، علی گڈھ،

عرصہ ہوا ایک انگریز صاحب قلم مسٹر وی سی او کنر نے خدا بخش خان کے مشہور کتب خانے کے بعض نادر فارسی اور عربی مخطوطات پر ایک کتاب لکھی تھی، مذکورہ بالا کتاب اسی کا اردو ترجمہ ہے، مصنف نے اس مین عام فہرست نگارون کی طرح محض کتابون کے نام گنانے اور ان کے مختصر تعارف پر اکتفا نہین کیا ہے، بلکہ ان کی تاریخی اہمیت، مصوری، و نقش آرائی، موضوع و مباحث، داخلی و خارجی خصوصیات، تاریخی کتابون کے ہیرو ون، ان کے مصنفین، اور خطاطون کے حالات اور کتاب سے متعلق مختلف قسم کے دلچسپ و مفید معلومات کو ایسے دلکش ادیبانہ بلکہ شاعرانہ انداز مین تحریر کیا ہے کہ ایک خشک موضوع کی کتاب مین ناول و افسانے کا لطف پیدا ہو گیا ہے، اس حیثیت سے اس کتاب مین بڑی جدت ہے، ان کتابون کے علاوہ جن پر مصنف نے تبصرہ کیا ہے، کتاب کے آخر مین عربی و فارسی کے کئی سو نادر مخطوطات کی ایک فہرست ہے، اس مین ان کی خصوصیات کا مختصر تذکرہ کر دیا گیا ہے، اور کتب خانہ اس کے بانی اور نوادر کتب کے خطاطون کے تاریخی حالات بھی لکھ دیئے ہین، ان خصوصیات کی بنا پر یہ کتاب محض فہرست اور حوالہ کی کتاب نہین رہ گئی ہے، بلکہ ایک دلکش ادبی مرقع بن گئی ہے، جو عام اصحاب ذوق کے بھی مطالعہ کے لائق ہے، لائق مترجم نے ترجمہ مین اصل کی ادبی خوبیون کو قائم رکھنے کی پوری کوشش کی ہے،

فیض الرحمٰن از مولانا محمد یعقوب صاحب عثمانی تقطیع بڑی ضخامت ۱۴۲ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت معمولی، قیمت عہ، پتہ:- مکتبہ فیض القرآن دیوبند،

مصنف مرحوم دیوبند کے ممتاز عالم تھے، ابھی چند مہینے ہوئے ان کا انتقال ہوا ہے، تفسیر قرآن سے ان کو خاص ذوق تھا، اس کی اشاعت کے لئے انھون نے فیض القرآن کے نام سے ایک ادارہ بھی قائم کیا، اور اسکی

ابتدا مذکورہ بالا کتاب کی اشاعت سے کی تھی کہ خود اُن کی زندگی کا ورق آخر ہوگیا، اس کتاب مین اعوذ باللہ، بسم اللہ، معوذتین، اور سورۂ اخلاص کی تفسیر ہے، اس تفسیر مین مذکورہ بالا آیات و سور کی مفصل تشریح و تاویل کی گئی ہے، اور ان کے اسرار و حکم بیان کئے گئے ہین، اور ان سے متعلق دوسرے فوائد اور تفسیری معلومات و مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے، ان مین خالص تفسیر کے ساتھ بعض لطائف ادبی اور ایسی باتین بھی معرض تحریر مین آگئی ہین، جن کو قرآن مجید کی تفسیر سے علاقہ نہین ہے، اور وہ علمی حیثیت سے مفید اور قابلِ قبول ہین، البتہ سورۂ اخلاص کی تفسیر خالص قرآنی اور موثر اور دلنشین ہے، مجموعی حیثیت سے یہ تفسیر قرآن پاک کا ذوق رکھنے والون کے مطالعہ کے لائق ہے،

کچھ زر کی بابت از جناب ابو سالم صاحب ایم اے، علیگ، استاذ شعبۂ معاشیات مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ، تقطیع بڑی، ضخامت ۲۰۴ صفحات کاغذ، کتابت، طباعت بہتر، قیمت مجلد للعہ ، پتہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڈھ،

اس زمانہ مین معاشیات کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ سیاست بھی اس کے تابع ہوگئی ہے، مذکورۂ بالا کتاب اسی موضوع پر ہے، اس مین مصنف نے زر کی اہمیت اس کی تاریخ اس کی قسمون آہنگون کے نظام ان سے زر کے تعلق زر کی قیمت اور اس سے متعلقہ مسائل، نظریۂ آمد و خرچ، تجارتی مد و جزر کے زر سے تعلق اور غیر ملکی زر وغیرہ معاشیات کے جملہ مسائل کو تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے، مصنف کی نظر معاشیات پر گہری ہے، اور اردو تحریر پر بھی ان کو پوری قدرت حاصل ہے، اس لئے انھون نے ان پیچیدہ اور دقیق مباحث کو ایسے صاف اور سلجھے ہوے انداز مین تحریر کیا ہے کہ ایک ناواقف فن کو بھی ان کے سمجھنے مین دقت نہین ہوتی، اور نہ ان کے پڑھنے سے طبیعت گھبراتی ہے، اردو مین اس موضوع پر جس قدر کتابین لکھی گئی ہین، ان مین یہ کتاب امتیازی حیثیت رکھتی ہے،

"م"